# نصرانیت

## قرآن کی روشنی میں

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ



www.only1or3.com
www.onlyoneorthree.com

www.only1or3.com
www.onlyoneorthree.com

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

# نصرانیت

## قرآن کی روشنی میں

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مُرتبین:

نعیم صدیقی ○ عبدالوکیل علوی

**

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور

**

| | |
|---|---|
| کتاب: | نصرانیت قرآن کی روشنی میں |
| تالیف: | مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ |
| ترتیب: | نعیم صدیقی۔ عبدالوکیل علوی |
| ناشر: | ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ<br>غزنی سٹریٹ رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار لاہور<br>فون: 7236665-7234014 |
| مطبع: | وطن عزیز پرنٹرز لاہور |
| ای میل: | E-Mail: Idaratarjuman@yahoo.com |

اشاعت:

| | | |
|---|---|---|
| طبع اوّل: | | |
| طبع دوم: | ۱۹۸۵ء | ۱۱۰۰ |
| طبع سوم: | ۱۹۹۵ء | ۲۰۰۰ |
| طبع چہارم: | ۲۰۰۰ء | ۲۰۰۰ |
| طبع پنجم: | ۲۰۰۸ء | ۲۰۰۰ |

ہدیہ: /روپے

# نصرانیت

## قرآن کی روشنی میں

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرض ناشر

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے ----- اور درود و سلام نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام بنی نوع انسان تک پہنچایا۔

زیر نظر کتاب "نصرانیت قرآن کی روشنی میں" پہلے "یہودیت و نصرانیت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ جس میں "یہودیت قرآن کی روشنی میں" اور "نصرانیت قرآن کی روشنی میں" دونوں کتب ایک جلد میں یکجا تھیں۔ اب ہم نے اس کتاب کو مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی نظر ثانی کے بعد دو الگ الگ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ مولانا مغفور کے حواشی کی روشنی میں کتابت کی اغلاط کی بھی اصلاح کر دی گئی ہے اور معیار طباعت و کتابت پہلے سے بہتر بنا دیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ یہ کتاب مولانا مغفور کی مختلف تحریروں کو ان کے وسیع لٹریچر میں سے یکجا کر کے ترتیب دی گئی ہے تاہم اپنے موضوع پر جامع معلومات کی بنا پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین اس سے پوری طرح مستفید ہوں گے اور ان کو نصرانیت کی تاریخ اور اس کے اصلی خد و خال سے واقفیت حاصل ہو سکے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا مرحوم و مغفور کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہمیں سیدھی راہ پر چلنے اور دین حنیف کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ناشر

سید خالد فاروق مودودی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡكَ الۡیَهُوۡدُ وَ
لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے
جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔

(آیت ۱۲۰۔ سورۃ البقرہ)

# فہرست

## باب ۱

## ظہور مسیح علیہ السلام

## باب ۲

## حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اور تعلیمات ۲۹

## باب ۸



## عیسائیوں سے متعلق مسلمانوں کے دو اہم مسائل

## باب ۹

## متفرقات

# باب ۱

# ظہورِ مسیح علیہ السّلام

فصل ۱

# حضرتِ مریم اور ولادتِ عیسیٰؑ

## اُمِّ مریم کی نذر

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ‎(آل عمران - آیت ۳۵)

ترجمہ: "(وہ اس وقت سن رہا تھا) جب عمران کی عورت کہہ رہی تھی کہ "میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا، میری اس پیشکش کو قبول فرما، تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

اگر عمران کی عورت سے مراد "عمران کی بیوی" لی جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ یہ وہ عمران نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بلکہ یہ حضرت مریم کے والد تھے، جن کا نام شاید عمران ہوگا (مسیحی روایات میں حضرت مریم کے والد کا نام یواخیم IOACHIM لکھا ہے۔ اور اگر عمران کی عورت سے مراد آلِ عمران کی عورت لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت مریم کی والدہ اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعۂ معلومات نہیں ہے جس سے ہم قطعی طور پر ان دونوں معنوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکیں، کیونکہ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت مریم کے والد کون تھے اور ان کی والدہ کس قبیلے کی تھیں۔ البتہ اگر یہ روایت صحیح مانی جائے کہ حضرت یحییٰ کی والدہ اور حضرت مریم کی والدہ آپس میں رشتہ کی بہنیں تھیں تو پھر "عمران کی عورت" کے معنی قبیلہ عمران کی عورت ہی درست ہوں گے (۱)
کیونکہ انجیل لوقا میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے کہ حضرت یحییٰ کی والدہ حضرت ہارونؑ کی اولاد سے تھیں (لوقا ۱:۵)

## حضرت مریم کی پیدائش

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ

وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ (آل عمران۔ آیت ۳۶)

ترجمہ:۔ "پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اُس نے کہا۔ "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے ـــــ حالانکہ جو کچھ اُس نے جنا تھا، اللہ کو اس کی خبر تھی ـــــ اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا"۔

یعنی لڑکا اُن بہت سی کمزوریوں اور تمدّنی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے، جو لڑکی کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں، لہٰذا اگر لڑکا ہوتا تو مقصد زیادہ اچھی طرح حاصل ہو سکتا تھا جس کے لیے میں اپنے بچے کو تیری راہ میں نذر کرنا چاہتی تھی۔ (۲)



## دُعا اور قبولیتِ دُعا

وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْۤ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۞ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۔ (آل عمران۔ آیت ۳۶، ۳۷)

ترجمہ:۔ "خیر! میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اُسے اور اُس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں"۔ آخر کار اُس کے رب نے اُس لڑکی کو بخوشی قبول فرما لیا اور اُسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اُٹھایا"۔

## حضرت مریم حضرت زکریاؑ کی کفالت میں

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ (آل عمران۔ آیت ۳۷)

ترجمہ:۔ "اور زکریاؑ کو اس کا سرپرست بنا دیا۔ زکریاؑ جب کبھی اس کے پاس محراب[ۖ] میں جاتا تو اُس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا"۔

اب اس وقت کا ذکر شروع ہوتا ہے جب حضرت مریم سن رُشد کو پہنچ گئیں اور بیت المقدس کی

---

ۖ محراب سے لوگوں کا ذہن بالعموم اس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہیں، لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صوامع اور کنیسوں میں اصل عبادت گاہ کی عمارت سے متصل سطح زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے ہیں جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدام اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں، انھیں محراب کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریم معتکف رہتی تھیں۔ (۳)

عبادت گاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں اور ذکرِ الٰہی میں شب و روز مشغول رہنے لگیں۔ حضرت زکریا جن کی تربیت میں وہ دی گئی تھیں، غالباً رشتے میں ان کے خالو تھے اور ہیکل کے مجاوروں میں سے تھے۔ یہ وہ زکریا نبی نہیں ہیں جن کے قتل کا ذکر بائبل کے پرانے عہدنامے میں آیا ہے۔ (۲)

قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ ھٰذَا ؕ قَالَتْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (آلِ عمران۔ آیت ۳۷)

ترجمہ:۔ "پوچھا مریم، یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟" وہ جواب دیتی "اللہ کے پاس سے آیا ہے" اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔"

## حضرت مریم کے پاس ملائکہ کی آمد

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ۔ (آلِ عمران۔ آیات ۴۲۔۴۳)

ترجمہ:۔ "پھر وہ وقت یاد جب مریم سے فرشتوں نے آکر کہا "اے مریم، اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ اے مریم، اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سربسجود ہو، اور جو بندے اس کے حضور میں جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک جا۔"

## حضرت عیسیٰ کی بشارت

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ ۖ اسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْہًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۝ وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَہْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ (آلِ عمران۔ آیات ۴۵۔۴۶۔۴۷)

ترجمہ:۔ "اور جب فرشتوں نے کہا "اے مریم، اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے اُس کا نام مسیح عیسیٰ ابنِ مریم ہوگا، دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا، اللہ کے مقرب بندوں میں

شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا۔" یہ سن کر مریم بولی۔ "پروردگار! میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔" جواب ملا۔ "ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔"

یعنی باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا، تیرے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ یہی لفظ کذٰلک (ایسا ہی ہوگا) حضرت زکریاؑ کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہوم وہاں ہے وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اسی معنی کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریم کو صنفی مواصلت کے بغیر بچہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی، اور فی الواقع اسی صورت سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ ورنہ اگر بات یہی تھی کہ حضرت مریم کے ہاں اُسی معروف فطری طریقہ سے بچہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، اور اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش فی الواقع اسی طرح ہوئی ہوتی تو یہ سارا بیان قطعی مہمل ٹھہرتا ہے جو چوتھے رکوع سے چھٹے رکوع تک چلا جا رہا ہے، اور وہ تمام بیانات بھی بے معنی قرار پاتے ہیں جو ولادتِ مسیحؑ کے باب میں قرآن کے دوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اِلٰہ اور ابن اللہ اسی وجہ سے سمجھا تھا کہ ان کی پیدائش غیر فطری طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی، اور یہودیوں نے حضرت مریمؑ پر الزام بھی اسی وجہ سے لگایا کہ سب کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ لڑکی غیر شادی شدہ تھی اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ اگر یہ سرے سے واقعہ ہی نہ تھا تب ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا بالکل کافی تھا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو، وہ لڑکی شادی شدہ تھی، فلاں شخص اس کا شوہر تھا، اور اسی کے نُطفے سے حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مختصر سی دو ٹوک بات کہنے کے بجائے آخر اتنی لمبی تمہیدیں اٹھانے اور پیچ در پیچ باتیں کرنے اور صاف صاف مسیح بن فلاں کہنے کے بجائے مسیح بن مریمؑ کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی جس سے بات سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جائے۔ پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسبِ معمول باپ اور ماں کے اِتصال سے ہوئی تھی وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اظہارِ مافی الضمیر اور بیانِ مدعا کی اُتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں۔ (معاذ اللہ) ۵

## مشرقی جانب گوشہ نشینی

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۖ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم ۱۶-۱۷)

ترجمہ:۔ "اور (اے محمدؐ) اس کتاب میں مریم کا حال بیان کرو، جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی۔ اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔"

سورۂ آل عمران میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ نے اپنی مانی ہوئی نذر کے مطابق ان کو بَیۡتُ الۡمَقۡدِس میں عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا اور حضرت زکریا نے ان کی حفاظت و کفالت اپنے ذمے لے لی تھی۔ وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریم بیت المقدس کی ایک محراب میں معتکف ہو گئی تھیں۔ اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب جس میں حضرت مریم معتکف تھیں بَیۡتُ الۡمَقۡدِس کے شرقی حصے میں واقع تھی اور انھوں نے معتکفین کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائبل کی موافقت کی خاطر مکاناً شرقیاً سے مراد ناصرہ لیا ہے انھوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ یروشلم کے شمال میں ہے نہ کہ مشرق میں۔ (۶)

## فرشتے کی آمد پر ان کا استعجاب

قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۝ قَالَتْ أَنّٰى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝ ......... (مریم ۱۸ تا ۲۱)

ترجمہ:۔ "مریم یکایک بول اٹھی کہ "اگر تو خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔" اُس نے کہا "میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔" مریم نے کہا "میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور نہ میں کوئی بدکار عورت ہوں ......"

حضرت مریم کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ "ایسا ہی ہوگا" ہرگز اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ

بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہو گا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہو گا باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ اُوپر انہی الفاظ میں حضرت زکریا کا استعجاب نقل ہو چکا ہے اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس جواب کا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ ذاریات، آیات ۲۸-۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور حضرت سارہ کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہو گا تو فرشتہ اُن کو جواب دیتا ہے کہ کَذٰلِكَ "ایسا ہی ہو گا"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں اگر کَذٰلِكَ کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھے چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہو گا جیسے دنیا بھر کی عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریحاً معجزے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور اسی معنی پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے"۔ لہٰذا اس ارشاد کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ (۷)

## جائے اعتکاف سے دُور چلی جاتی ہیں

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ (مریم ۲۲)

ترجمہ: "مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دور کے مقام پر چلی گئی۔"

دُور کے مقام سے مراد بیتِ لحم ہے۔ حضرت مریم کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت و ملامت اور عام

بدنامی سے تو بچی رہیں۔

یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال، سب کو چھوڑ چھاڑ کر وہ زچگی کے لیے تن تنہا ایک دور دراز مقام پر چلی جاتیں۔ (۸)

## حالتِ زچگی کے وقت ان کی پریشانی

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ۝ (مریم-۲۳)

ترجمہ: "پھر زچگی کی تکلیف نے اُسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی "کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا۔"

ان الفاظ سے اُس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریم اس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں انھیں ڈالا ہے اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا۔ اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا "غم نہ کر" اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریم نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہوا کرتا۔ (۹)

## فرشتے کی ندا

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ۝ وَهُزِّیْٓ اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْكِ رُطَبًا جَنِیًّا ۝ فَكُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْنًا ج فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ۝ (مریم-۲۵-۲۶)

ترجمہ: فرشتے نے پائنتی سے اس کو پکار کر کہا "غم نہ کر۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے۔ اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔

پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمان کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔"

مطلب یہ ہے کہ بچّے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدائش پر جو کوئی بھی معترض ہو اس کا جواب اب ہمارے ذمے ہے (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چُپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ رائج تھا) یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریم کو اصل پریشانی کیا تھی۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلوٹھی کا بچّہ اگر دنیا کے معروف طریقہ پر پیدا ہو تو آخر اُسے چُپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟ (۱۰)

## حضرت مریم قوم کے سامنے

فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۖ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۝ يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا (مریم ۲۷، ۲۸)

ترجمہ: "پھر وہ اس بچّے کو لیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ لوگ کہنے لگے "اے مریم، یہ تو تُو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن، نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔"

ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انھیں ظاہری معنی میں لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مریم کا کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُختِ ہارون کے معنی "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں، کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے۔ مثلاً قبیلہ مُضر کے آدمی کو یا اخا مُضر (اے مُضر کے بھائی) اور قبیلہ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ہمدان (اے ہمدان کے بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنی کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی منقول ہوئے ہیں۔ اور دوسرے معنی کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اس معنی کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ اس واقعے سے قوم میں جو ہیجان برپا ہوا تھا اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک گمنام شخص کی کنواری بہن گود میں بچّہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریم کے گرد جمع کر دیا تھا وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادۂ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیث مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اصولاً

قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی لازماً "ہارون کی بہن" ہی ہیں۔ مُغیرہؓ بن شعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے، حالانکہ حضرت ہارونؑ ان سے سینکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہؓ ان کے اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے اور انھوں نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ "تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیاء و صلحاء کے نام پر رکھتے تھے"؟ حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔ (۱۱)

جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش کے منکر ہیں وہ آخر اس بات کی کیا معقول توجیہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مریم کے بچہ لیے ہوئے آنے پر قوم کیوں چڑھ کر آئی اور اُن پر طعن اور ملامت کی بوچھاڑ اس نے کیوں کی؟ (۱۱)

## گہوارے میں حضرت عیسیٰؑ کا کلام کرنا

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ (مریم ۲۹-۳۱)

ترجمہ: "مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا "ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے"؟ بچہ بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں۔"

## حضرت عیسیٰؑ کی ابتدائی پرورش کہاں ہوئی؟

مختلف لوگوں نے اس سے مختلف مقامات مراد لیے ہیں۔ کوئی دمشق کہتا ہے، کوئی الرملہ، کوئی بیت المقدس اور کوئی مصر۔ مسیحی روایات کے مطابق حضرت مریم حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد ان کی

---

لہ حضرت عیسیٰؑ کے تفصیلی حالات مؤلف موصوف کی زیرِ طبع کتاب تذکرہ انبیاء و رسل میں ملاحظہ ہوں۔ (از مرتب)

حفاظت کے لیے دو مرتبہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئیں۔ پہلے ہیرودیس بادشاہ کے عہد میں وہ انھیں مصر لے گئیں اور اس کی موت تک وہیں رہیں۔ پھر ارخلاؤس کے عہدِ حکومت میں ان کو گلیل کے شہر ناصرہ میں پناہ لینی پڑی (متی ۲۔ ۱۳ تا ۲۳) اب یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ قرآن کا اشارہ کس مقام کی طرف ہے۔ لغت میں رُبوہ اس بلند زمین کو کہتے ہیں جو ہموار ہو اور اپنے گردوپیش کے علاقے سے اُونچی ہو۔ ذاتِ قرار سے مراد یہ ہے کہ اس جگہ ضرورت کی سب چیزیں پائی جاتی ہوں اور رہنے والا وہاں بفراغت زندگی بسر کرسکتا ہو اور معین سے مراد بہتا ہوا پانی یا چشمہ جاری ہے۔ (۱۲)

## اس واقعہ کی ایک مہمل تاویل

قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ "ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے" یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع ومحل اور سیاق وسباق پر کچھ بھی غور کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۶ اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰ دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گہوارے میں ایک نوزائیدہ بچے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰؑ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گہوارے میں بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی۔ (۱۳)

## بے باپ پیدائش کی دلیل

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا (مریم ۳۲)

ترجمہ: "اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھے ظالم وشقی نہیں بنایا۔"

یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ

ان کو عیسیٰ ابن مریم کہا گیا ہے۔ (۱۴)

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ۰ (مریم ۳۳)

ترجمہ:۔ "سلام ہے مجھ پر کہ جب میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں۔"

یہ ہے وہ "نشانی" جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالےٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیت المقدس میں مُعتکِف اور حضرت زکریا کے زیر تربیت تھی۔ دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجہات یکلخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریم پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ (۱۵)

فصل ۲



# حضرت مسیحؑ کی معجزانہ پیدائش کے متعلق چند نکات

## حضرت مسیحؑ کی پیدائش اور سنّت اللہ

یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی سنّت نہیں بدلتا، اپنی جگہ صحیح ہے۔ مگر اللہ کی سنّت کیا ہے اور کیا نہیں ہے، اس کا فیصلہ کرنے والے ہم نہیں بلکہ خود اللہ ہی ہے۔ جس چیز کو خدا نے خود اپنی سنّت کہا ہو اس کے خلاف تو کچھ نہیں ہو سکتا مگر جسے ہم اس کی سنّت قرار دے لیں اس کے خلاف بہت کچھ ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ نے اس کی پابندی کا کوئی ذمہ نہیں لیا ہے۔ آخر اللہ نے یہ کب کہا ہے کہ مرد کے بغیر عورت کے ہاں بچہ پیدا ہونا میری سنّت کے خلاف ہے، یا میری سنّت یہ ہے کہ عورت کے ہاں صرف مرد کے ملاپ ہی سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ بنی نوعِ انسان کے اوّلین فرد اور اس کے جوڑے کی پیدائش آخر کس مرد اور عورت کے ملاپ کا نتیجہ تھی؟ اللہ نے خود فرمایا ہے کہ ہم نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور ان کے جوڑے کو ان سے پیدا کیا۔ اگر اس جوڑے کی پیدائش سنّت اللہ کے خلاف نہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام کی بغیر والد کے پیدائش کیوں سنّت اللہ کے خلاف ہے؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود بھی مسیح علیہ السلام کی پیدائش کو حضرت آدم علیہ السّلام کی پیدائش سے تشبیہ دی ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ (آل عمران۔ آیت ۵۹)

ترجمہ: "درحقیقت عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ جیسی ہے جسے اللہ نے مٹی سے بنایا، پھر فرمایا کہ ہو جا اور بس وہ ہو گیا۔" (۱۶)

## معجزانہ پیدائش کی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ ابن اللہ نہیں ہیں

ذَٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ۝ مَا كَانَ لِلَّهِ

اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ؕ (مریم ۳۴-۳۵)

ترجمہ: "یہ ہے عیسیٰؑ ابن مریم اور یہ ہے اُس کے بارے میں وہ سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا، اور بس وہ ہو جاتی ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ ہونے کا جو عقیدہ عیسائیوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ باطل ہے۔ جس طرح ایک معجزے سے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش نے ان کو خدا کا بیٹا نہیں بنا دیا اسی طرح ایک دوسرے معجزے سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر انھیں خدا کا بیٹا قرار دے دیا جائے۔ عیسائیوں کی اپنی روایات میں بھی یہ بات موجود ہے کہ حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں ایک ہی طرح کے معجزے سے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ لوقا کی انجیل میں قرآن کی طرح ان دونوں معجزوں کا ذکر ایک سلسلۂ بیان میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ عیسائیوں کا غلو ہے کہ وہ ایک معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں اور دوسرے معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بیٹا بنا بیٹھے ہیں۔ (۱۷)

## پیدائش میں حضرت عیسیٰؑ کی حضرت آدمؑ سے مماثلت

وَالَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ؕ (الانبیآء ۹۱)

ترجمہ: "اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ ہم نے اُس کے اندر اپنی روح سے پھونکا اور اُسے اور اُس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا۔"

مراد ہیں حضرت مریم علیہا السلام (تفہیم القرآن ج ۳۔ الانبیآء، حاشیہ ۸۸)

حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ

اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ؕ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ؕ (ص۔ آیات ۷۱، ۷۲)

ترجمہ: "میں مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں، پس اے فرشتو! جب میں اسے پورا بنا لوں اور اس میں اپنی رُوح سے پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔"

اور یہی بات حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مختلف مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا:

رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْہُ (آیت ۱۷۱)

ترجمہ: "اللہ کا رسول اور اس کا فرمان جو مریم کی طرف القا کیا گیا اور اس کی طرف سے ایک رُوح"۔

اور سورۂ تحریم میں ارشاد ہوا۔

وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا

(آیت ۱۲)

ترجمہ: "اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی پس پھونک دیا ہم نے اُس میں اپنی رُوح سے"۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور حضرت آدمؑ کی پیدائش کو ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیتا ہے، چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (آیت ۵۹)

"عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے جس کو اللہ نے مٹی سے بنایا پھر فرمایا "ہوجا" اور وہ ہوجاتا ہے"۔

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ معمولی طریقۂ تخلیق کے بجائے جب اللہ تعالیٰ کسی کو براہِ راست اپنے حکم سے وجود میں لاکر زندگی بخشتا ہے تو اس کو "اپنی روح سے پھونکنے" کے الفاظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ اس رُوح کی نسبت اللہ کی طرف غالباً اس وجہ سے کی گئی ہے کہ اس کا پھونکا جانا معجزے کی غیر معمولی شان رکھتا ہے۔ (۱۸)

## اعجازی پیدائش عجائباتِ تخلیق کا ایک نمونہ ہے

قُلْ فَمَنْ یَّمْلِکُ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّھْلِکَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّہٗ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ وَ لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَھُمَا ط یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ط وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (المائدہ، آیت ۱۷)

ترجمہ: "اے محمدؐ! ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابنِ مریم اور اُس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کسی کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔"

اس فقرے میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ محض مسیحؑ کی اعجازی پیدائش اور ان کے اخلاقی کمالات اور محسوس معجزات کو دیکھ کر جو لوگ اِس دھوکہ میں پڑ گئے کہ مسیحؑ ہی خدا ہیں وہ درحقیقت نہایت نادان ہیں۔ مسیحؑ تو اللہ تعالیٰ کے بے شمار عجائب تخلیق میں سے محض ایک نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان ضعیف البصر لوگوں کی نگاہیں چوندھیا گئیں۔ اگر ان لوگوں کی نگاہ کچھ وسیع ہوتی تو انھیں نظر آتا کہ اللہ نے اپنی تخلیق کے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں اور اس کی قدرت کسی حد کے اندر محدود نہیں ہے۔ بس یہ بڑی بے دانشی ہے کہ مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر اسی پر خالق ہونے کا گمان کر لیا جائے۔ دانشمند وہ ہیں جو مخلوق کے کمالات میں خالق کی عظیم الشان قدرت کے نشانات دیکھتے ہیں اور ان سے ایمان کا نور حاصل کرتے ہیں۔ (۱۹)

## "کلمہ" اور "رُوح من اللہ" کی بحث

اصل میں لفظ "کلمہ" استعمال ہوا ہے۔ مریمؑ کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کر لے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا۔ مگر انھوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "نطق" ( LOGOS ) کا ہم معنی سمجھ لیا پھر اس کلام و نطق سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی، پھر یہ قیاس قائم کیا کہ ———— اللہ تعالیٰ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

مسیح کو رُوْحٌ مِّنْهُ (خدا کی طرف سے ایک رُوح) کہا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (ہم نے پاک رُوح سے مسیح کی مدد کی) دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ رُوح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی۔ سراسر حقانیت اور راست

بازی تھی، اور از سرتا پا فضیلتِ اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی۔ مگر انھوں نے اس میں بھی غلو کیا، رُوحٌ مِّنَ اللہِ کو عین رُوح اللہ قرار دے لیا، اور روح القدس (HOLY GHOST) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی رُوحِ مقدس تھی جو مسیحؑ کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیحؑ کے ساتھ ایک تیسرا خدا رُوح القدس بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ لُطف یہ ہے کہ آج بھی انجیل متی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ "فرشتے نے اسے (یعنی یوسف نجار کو) خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابنِ داؤد، اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ رُوح القدس کی قدرت سے ہے" (باب ۱۔ آیت ۲۰)

## (۳۰) عیسیٰ اور مریم علیہما السلام دونوں مل کر ایک نشانی ہیں

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ ۝ (المؤمنون۔ ایت ۵۰)

ترجمہ:۔ "اور ابنِ مریم اور اس کی ماں کو ہم نے ایک نشانی بنایا اور ان کو ایک سطحِ مرتفع پر رکھا جو اطمینان کی جگہ تھی اور چشمے اس میں جاری تھے۔"

یہ نہیں فرمایا کہ ایک نشانی ابن مریم تھے اور ایک نشانی خود مریم۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ابنِ مریم اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا، بلکہ فرمایا یہ ہے کہ دونوں مل کر ایک نشانی بنائے گئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ باپ کے بغیر ابنِ مریم کا پیدا ہونا، اور مرد کی صحبت کے بغیر مریم کا حاملہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو ان دونوں کو ایک نشانی بناتی ہے۔ جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بے پدر کے منکر ہیں وہ ماں اور بیٹے کے ایک آیت ہونے کی کیا توجیہ کریں گے۔ (مزید تفصیل کے لیئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول آلِ عمران، حواشی ۴۴۔ ۵۳، النسآء حواشی ۱۹۰۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ جلد سوم مریم، حواشی ۱۵ تا ۲۲۔ الانبیآء، حواشی ۸۹۔ ۹۰)

یہاں دو باتیں اور بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اول یہ کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کا معاملہ جاہل انسانوں کی ایک دوسری کمزوری کی نشان دہی کرتا ہے۔ انبیاء پر تو ایمان لانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا کہ تم بشر ہو، بھلا بشر بھی کہیں نبی ہو سکتا ہے۔ مگر حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کے جب لوگ معتقد ہوئے تو پھر ایسے ہوئے کہ انھیں بشریت کے مقام سے اُٹھا کر خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ دوم یہ کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش، اور ان کی گہوارے والی تقریر سے اس کے معجزہ ہونے کا کھلا کھلا ثبوت دیکھ لینے

کے باوجود ایمان لانے سے انکار کیا اور حضرت مریم پر تہمت لگائی ان کو پھر سزا بھی ایسی دی گئی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا کے سامنے ایک نمونۂ عبرت بن گئی۔ (۲۱)

# باب ۲

# حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اور تعلیماتؑ

فصل ۱

# حضرت عیسیٰ کی اساسی تعلیم

## میں بینات لے کر آیا ہوں

وَلَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَیِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ (الزخرف ۶۳-۶۴)

ترجمہ:۔ "اور جب عیسیٰؑ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا تو اُس نے کہا تھا کہ "میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے"۔

یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ میں خدا ہوں یا خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو، بلکہ ان کی دعوت وہی تھی جو دوسرے تمام انبیاء کی دعوت تھی۔ (۲۲)

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝

(مریم ۳۶)

ترجمہ:۔ "(اور عیسیٰؑ نے کہا تھا) "اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اُسی کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت بھی وہی تھی جو تمام دوسرے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ انھوں نے اس کے سوا کچھ نہیں سکھایا تھا کہ صرف خدائے واحد کی بندگی کی جائے۔ اب یہ جو تم نے ان کو بندے کے بجائے خدا بنا لیا ہے اور انھیں عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کر رہے ہو، یہ تمہاری

اپنی ایجاد ہے۔ تمہارے پیشوا کی یہ تعلیم ہرگز نہیں تھی۔ (۴۳)

## نبوّت عیسیٰؑ کے بیّنات

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۚ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِإِذْنِي ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَآئِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ (المآئدہ۔ آیت ۱۱۰)

ترجمہ:۔ "پھر تصور کرو اس موقع کا جب اللہ فرمائے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰؑ، یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی، میں نے روح پاک سے تیری مدد کی، تو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی، تو میرے حکم سے مٹی کا پتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا، تو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تو مُردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا، پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکر حق تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو میں نے ہی تجھے ان سے بچایا۔"

## دین موسوی کی تجدید

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (آل عمران آیت ۵۰۔ ۵۱)

ترجمہ:۔ "اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے۔"

یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بنا ڈالتا اور اپنے ان کمالات کے زور پر تمہیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے

ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا لیکن میں تو اسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاءؑ نے پیش کیا تھا، رائج الوقت اناجیل میں بھی واضح طور پر ہمیں ملتی ہے۔ مثلاً متی کی روایت کے مطابق پہاڑی کے وعظ میں مسیح علیہ السلام صاف فرماتے ہیں۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔"

ایک یہودی عالم نے حضرت مسیحؑ سے پوچھا کہ اصل دین میں اولین حکم کونسا ہے۔ جواب میں آپ نے فرمایا: "خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔" (متی ۲۲: ۳۴-۴۰)

پھر حضرت مسیحؑ اپنے شاگردوں سے فرماتے ہیں۔

"فقیہ اور فریسی موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو مگر ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔" (متی ۲۳: ۲-۳) (۲۴)

## حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کے تین نکات

تمام انبیاءؑ کی طرح حضرت عیسیٰؑ کی دعوت کے بنیادی نکات بھی تین تھے:

ایک یہ کہ اقتدار اعلیٰ، جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اس مقتدر اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو، دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔

پس درحقیقت حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاءؑ کے مشن میں ایک سرِمو فرق نہیں ہے۔[۲۵]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

## انجیل اور دعوت کے تین نکات

افسوس ہے کہ موجودہ اناجیل میں مسیح علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا جس طرح قرآن (آل عمران ۵۰۔۵۱) میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں وہ تینوں بنیادی نکات ہمیں ان کے اندر ملتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ مسیحؑ صرف اللہ کی بندگی کے قائل تھے ان کے اس اشارے صاف ظاہر ہوتی ہے۔

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴ : ۱۰)

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے قائل تھے بلکہ ان کی ساری کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ زمین پر خدا کے امر شرعی کی اسی طرح اطاعت ہو جس طرح آسمان پر اس کے امر تکوینی کی اطاعت ہو رہی ہے۔

"تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو"

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نبی اور آسمانی بادشاہت کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کے متعدد اقوال سے معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کے اپنے ہی بھائی بند اور اہل شہر ان کی مخالفت کیلئے کھڑے ہوگئے۔ اس پر متی، مرقس اور لوقا تینوں کی متفقہ روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا "نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا" اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انھوں نے جواب دیا "ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا ۱۳ : ۳۳) آخری مرتبہ جب وہ یروشلم میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے شاگردوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا "مبارک ہے وہ بادشاہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے" اس پر یہودی علما ناراض

---

(حاشیہ صفحہ ۳۳) جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیئے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے، مالک الملک کی طرف سے اس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئیگا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدار اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔ (مؤلف)

ہوئے اور انھوں نے حضرت مسیحؑ سے کہا کہ آپ اپنے شاگردوں کو چُپ کریں اس پر آپ نے فرمایا "اگر یہ چُپ رہیں گے تو پتھر پکار اُٹھیں گے۔" (لوقا ۱۹ : ۳۸-۴۰) ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

"اے محنت اُٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو، سب میرے پاس آؤ، میں تم کو آرام دوں گا، میرا جُوا اپنے اُوپر اُٹھا لو...... میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا ہے۔" (متی ۱۱ : ۲۸-۳۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السّلام انسانی ساخت کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کرانا چاہتے تھے، متی اور مرقس کی اُس روایت سے خاص طور پر مترشح ہوتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علماء نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں۔ اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے جس پر یسعیاہ نبی کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ "یہ اُمّت زبان سے تو میری تعظیم کرتی ہے مگر اُن کے دِل مجھ سے دُور ہیں، کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔"

"تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے تورات میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزّت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو بُرا کہے وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمھارے کام آسکتی تھیں انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اُس کے لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔" (متی ۱۵ : ۳-۹، مرقس ۷ : ۵-۱۳) (۲۵)

فصل ۲

# مروّجہ چار انجیلوں میں تعلیماتِ عیسوی

چونکہ ہمارے زمانے کے موجودہ حالات ان حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں جن میں سیدنا مسیحؑ نے اہلِ فلسطین کو حکومتِ الٰہیہ کی دعوت دی تھی، اس لیے ان کے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے بعض اشارات نقل کرتے ہیں:

## دعوتِ توحید

"فقیہوں میں سے ایک نے ...... اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں سے اوّل حکم کون سا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے "اے اسرائیل سُن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ"۔ ... فقیہ نے اس سے کہا "اے استاد، کیا خوب تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں"۔ (مرقس ۱۲: ۲۸-۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر"۔ (لوقا ۴: ۸)

## حکومتِ الٰہی

"پس تم اس طرح دعا مانگو کہ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"۔ (متی ۶: ۹-۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیحؑ نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد روحانی بادشاہت تھی، یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ اُن کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکمِ شرعی اُسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اس کا قانونِ طبعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

## حق و باطل کی کشمکش کا پیغام

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں، میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور اس کی بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔"

## راہِ حق میں آزمائش ضروری ہے

"اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے[1] اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔"

(متی ۱۰: ۳۴-۳۹)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[2] سے انکار کر دے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے۔" (متی ۱۶: ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انھیں مروا ڈالیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔" (متی ۱۰: ۲۱-۲۲)

"دیکھو میں تمھیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں ..... آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمھیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمھارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔" (۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں، بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی[3] نہ کرے، تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور

---

[1] اپنی صلیب اٹھانے سے مراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے۔ جس طرح اردو محاورہ میں ہے۔ سر ہتھیلی پر رکھنا۔ (مؤلف)

[2] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراض ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔ (مؤلف)

[3] دشمنی کرنے سے مراد ان کی محبت اور ان کے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کرنا ہے۔ (مؤلف)

میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت تو شروع کی مگر تیار نہ کر سکا...... تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔" (لوقا ۱۴: ۲۶-۳۳)

## انقلابی تحریک

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اُٹھے تھے بلکہ پورے نظامِ تمدن و سیاست کو بدل دینا ان کے پیشِ نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے۔ اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

## مسلکِ صبر کی تلقین

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" (متی ۵: ۳۹-۴۱)

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کرتے ان سے نہ ڈرو۔ بلکہ ان سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔" (متی ۱۰: ۲۸)

## حُبِّ دُنیا سے اجتناب اور فکرِ آخرت کی دعوت

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو، جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔" (متی ۶: ۱۹-۲۰)

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت مندوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے۔ اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو

کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی باوجود اپنی شان وشوکت کے ان میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا پس جب خدا میدان کی گھاس کو، جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے، تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ تم پہلے اس کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمھیں مِل جائیں گی۔" (متی ۶: ۲۴-۳۳)

"مانگو تو تمھیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ، تو تمھارے واسطے کھولا جائے گا۔" (متی ۷: ۷)

## تحمُّلِ شدائد کی تعلیم کا مقصد

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے رہبانیت اور ترک وتجرید کی تعلیم دی ہے حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمُّلِ شدائد اور توکّل علی اللہ کی تعلیم وتربیت دیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظامِ تمدن وسیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل وذرائعِ زندگی اس کے قبضۂ اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اُٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان ومال کی محبت دل سے نکال نہ دے، سختیاں اٹھانے کو تیار نہ ہو جائے، اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات کو گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات ومصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہوتا ہے۔ یہ کام جنھیں کرنا ہو انھیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے۔ اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہونا چاہیے۔ خزائنِ رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے لڑ کر رزق پانے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا جو اس بات سے قطعِ نظر کر کے صرف خدا کے بھروسے پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو، وہی ان سے لڑ سکتا ہے۔

## حکومتِ الٰہیہ کا جامع مینی فسٹو

"اے محنت اُٹھانے والو! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ میں تمھیں آرام دوں

گا۔ کیونکہ میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا" (متی ۱۱ : ۲۸ - ۳۰)

شاید حکومتِ الٰہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پُر اثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جُوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جُوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں، وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

## حکومت خدمت ہے

"غیر قوموں کے بادشاہ ان پر حکومت چلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا، بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کی مانند ہے"۔

(لوقا ۲۲ : ۲۵ - ۲۶)

حضرت مسیحؑ یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون اور نمرود نہ بن جانا۔

## یہودی علمائے و مشائخ پر تنقید

"فقیہ اور فریسی[1] موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انھیں اپنی انگلی سے ہلانا بھی نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں"۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو"۔

---

[1] فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔ (مؤلف)

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مُرید ہو چکتا ہے تو اُسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"

"اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اُوپر سے تو خُوب صورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔" (متی ۲۳ : ۲-۲۸)

یہ اُس وقت کے حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اِس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

## حضرت عیسیٰؑ کے خلاف مذہبی اکابر کی سازش

"اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انھوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں[1] کے ساتھ اُس کے پاس بھیجا اور انھوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے استاد ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ ہمیں بتا کہ تو کیا سمجھتا ہے، قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا، اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکّہ مجھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لے آئے اُس نے اُن سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انھوں نے کہا۔ "قیصر کا" اس پر اُس نے کہا "جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو ادا کرو۔"

(متی ۲۲ : ۱۵-۲۱)

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے

---

[1] مسیح علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنتِ روم کی تابع فرمان تھی۔ اس کے بانی ہیرود کے نام سے اس کو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں (مؤلف)

یہ چاہتے تھے کہ حضرت مسیحؑ کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کو جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اسے کچلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے یہودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں؟ جواب میں حضرت مسیحؑ نے جو ذومعنی بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اسی معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اس حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانہ میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیحؑ نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا ان کی دعوت کے خلاف تھا اور نہ یہ فرمایا کہ اسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اس وقت تک اُن کی تحریک اس مرحلے پر نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا۔ اس لیے انھوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اُس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کر دو اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔ اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیحؑ کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیحؑ کو گرفتار کرائے جب کہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ اسکریوتی نے مسیحؑ کو پکڑوا دیا۔

## حضرت عیسیٰؑ کے خلاف اکابرِ یہود کا مقدمہ

"پھر اُن کی ساری جماعت اُٹھ کر اسے پیلاطُس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور انھوں نے الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکانے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیحؑ بادشاہ کہتے پایا ہے...... پیلاطُس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے..... وہ چلا چلا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلانا کارگر ہوا۔" (لوقا ۲۳: ۱-۲۳)

## حضورؐ کے مکی دورِ دعوت سے مماثلت

اس طرح دنیا میں مسیحؑ کا مشن ان لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو حضرت موسیٰؑ کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رُو سے حضرت مسیحؑ کی نبوت کا کل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدت میں انھوں نے اُتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکی زندگی کے ابتدائی تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا آیات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکی سورتوں اور زمانۂ قیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔

فصل ۳



# دعوتِ عیسیٰؑ مسیحیت کی تعبیر کے مطابق

اس فصل میں جناب مؤلف نے تعلیماتِ مسیحؑ کی اس غلط تعبیر سے تعرض کیا ہے جس پر موجودہ مسیحیت قائم ہے۔ چنانچہ اس بحث میں انجیل کی بعض ایسی عبارات بھی زیرِ گفتگو آئی ہیں جن کے متعلق فاضل مؤلف کا نقطۂ نظریہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیمات کی آئینہ دار ہیں اور ان عبارات کو اس سے پہلی فصل میں صحیح تعبیر کے ساتھ لیا جاچکا ہے۔

مسیحیت کی غلط تعبیرات کے ساتھ جو تعلیمات بحث میں مذکور ہیں، انھیں مسیحؑ سے باقاعدہ منسوب کر کے جہاں کہیں مؤلف نے اعتراض اٹھایا ہے وہاں ان کی مراد مسیحؑ کی شخصیت اور تعلیم کا وہ تصور ہے جو تحریف شدہ دینِ مسیحیت کے علمبرداروں نے پیدا کر لیا ہے ایسے موقعوں پر مراد جناب عیسیٰ ابن مریم نہیں ہیں جو خدا کے سچے رسول تھے۔ (مرتبین)

## تعلیمِ محبت کا مسیحی تصور

مسیحؑ کے نزدیک مذہب کا سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ "خدا سے محبت رکھنے کے بعد اپنے پڑوسی سے محبت رکھو۔" (متی ۲۲: ۳۹) لیکن وہ صرف محبت کرنے اور غصہ نہ کرنے ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ صاف الفاظ میں ایک سچے مسیحی کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ظلم اور شرارت کے مقابلہ میں سر جھکا دے، اور دوسروں کی حفاظت کرنا تو درکنار، خود اپنے حق کی حفاظت بھی نہ کرے۔ ان کی تعلیم کا گل سرِ سبد پہاڑی کا وعظ ہے جس پر مسیحی اخلاق کی بنیاد قائم ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، اور دانت کے بدلے دانت، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ تم شریر کا مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے، اور کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لینے

دے' اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا ...... تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو، جو تم پر لعنت کریں، ان کے لیے برکت چاہو، جو تم سے نفرت کریں، ان سے اچھا سلوک کرو، جو تمھیں ذلیل کریں اور تمھیں ستائیں، ان کے لیے دعا مانگو۔" (متی ۵: ۳۸-۴۴)

"میں تم سُننے والوں سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو جو تم سے عداوت رکھیں، ان کا بھلا کرو جو تم پر لعنت کریں ان کے لیے برکت چاہو، جو تمھاری بے عزتی کریں ان کے لیے دعا مانگو، جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا بھی پھیر دے، جو تیرا چوغہ لے اس کو کُرتہ لینے سے بھی منع نہ کر۔ جیسا تم اوروں سے برتاؤ چاہتے ہو تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو۔ اگر تم محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو۔ تو تمھارا کیا احسان ہے، کیونکہ گناہگار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔" (لوقا ۶: ۲۷-۳۲)

یہ تعلیم مسیحیت کی اصل الاصول ہے اور اس کا منشا خود اس کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک سچے مسیحی کو جو "آسمانی باپ کی طرح کامل" (متی ۵: ۴۸) بننا چاہتا ہو اور جس کا نصب العین "خدائے برتر کا بیٹا" (لوقا ۶: ۳۵) بننا ہو، کسی حال میں ظلم و تعدی کا مقابلہ قوت سے نہ کرنا چاہیے بلکہ شریروں اور مفسدوں کے سامنے اپنے حقوق سے خود بخود دست بردار ہو جانا چاہیے۔

## مسیحیت کی رُہبانی رُوح

اس تعلیم کے حُسن و قبح کا پورا پورا اندازہ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک مسیحیت کی رُوح کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

مسیحی مذہب جس شکل میں ہم تک پہنچا ہے، اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دراصل سنیاس، رہبانیت اور تیاگ کا مذہب ہے۔ اس میں انسان کی تمدنی زندگی کے لیے کوئی دستور العمل، کوئی شریعت، کوئی ضابطہ، قوانین وضع نہیں کیا گیا ہے۔ وہ انسان کو کچھ نہیں بتاتا کہ اس پر اس کی ذات، اس کے خاندان، اس کی قوم اور اس کے ابنائے نوع، اور اس کے خدا کے کیا حقوق ہیں۔ اور ان کو ادا کرنے کی صحیح صورت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مادی وسائل اور ذہنی و جسمانی قویٰ عطا کیے ہیں، ان کا مصرف کیا ہے۔ اور اسے ان چیزوں کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ عملی زندگی کے ان مسائل سے وہ کوئی بحث نہیں کرتا۔ اس کی ساری توجہات

کا مرکز صرف ایک سوال ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کس طرح "آسمانی بادشاہت" میں داخل ہو، یہی ایک سوال پورے مسیحی اخلاقیات کا محور ہے اور "مسیح" نے جو کچھ تعلیم دی ہے اس کا اصلی مقصد اسی نصب العین تک لے جانے کے لیے انسانی جماعت کو تیار کرنا ہے۔

## آسمانی بادشاہت اور دنیوی بادشاہت میں منافات

لیکن "آسمانی بادشاہت" مسیحیت کی نگاہ میں زمین کی بادشاہت کی ارتقائی صورت کا نام نہیں ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان بیج اور پھل کا تعلق تسلیم نہیں کرتی۔ بلکہ ان دونوں میں تضاد اور کُلی اختلاف کی قائل ہے اس کے نزدیک دنیوی بادشاہت اور آسمانی بادشاہت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں بالکل اُسی طرح بہم نہیں ہوسکتیں جس طرح آگ اور پانی بہم نہیں ہوسکتے۔ ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ آسمانی بادشاہت حاصل کرنے کا راستہ بھی زمین کی بادشاہت کے راستہ سے بالکل الگ اختیار کرتی ہے۔ ہر وہ چیز جو زمین کی بادشاہت کے ساز و سامان میں داخل ہے، آسمانی بادشاہت کے ساز و سامان سے خارج ہے۔ اور صرف خارج ہی نہیں بلکہ اس کا وجود انسان کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روکنے والا ہے۔ اسی لیے مسیحیت قدم قدم پر انسان کو تاکید کرتی ہے کہ اگر وہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو زمین کی بادشاہت کے سر و سامان سے کُلی اجتناب کرے اور اگر اس سے اجتناب نہیں کرسکتا تو آسمانی بادشاہت کی امید نہ رکھے۔ اسی اصل پر وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رُہبانیت کی تعلیم دیتی ہے اور تمدن و تہذیب سے الگ کرکے انسان کو کلیتہً تارک الدنیا بنا دینا چاہتی ہے۔

## دُنیوی سر و سامان سے کُلی اجتناب کے چند احکام

اس کی توضیح میں مسیح کے چند احکام نقل کر دینا کافی ہے:

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور اولاد اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی نفرت نہ رکھے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہوسکتا۔" (لوقا ۱۴: ۲۶)

"کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں؟ میں تم سے کہتا ہوں کہ نہیں، بلکہ تفرقہ کروانے، کیونکہ اب سے ایک گھر کے پانچ آدمی آپس میں مخالفت رکھیں گے، تین دو کے خلاف اور دو تین کے خلاف، باپ بیٹے سے مخالفت رکھے گا، اور بیٹا باپ سے، ماں بیٹی سے اور بیٹی ماں سے، ساس بہو سے اور بہو ساس سے۔" (لوقا ۱۲: ۵۱-۵۳)

"تم نے مفت پایا مفت دے دو، نہ سونا اپنے کیسہ میں رکھو نہ چاندی نہ پیتل - اپنے سفر کے لیے نہ جھولی لو نہ دو دو کُرتے، نہ جُوتیاں اور نہ لاٹھی۔" (متی ، ۱۰ : ۸-۱۰)

"اے چھوٹے گلے نہ ڈر کیونکہ تمہارے باپ کو پسند آیا کہ تمہیں بادشاہت دے - اپنا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دو - اور اپنے لیے ایسے بٹوے بناؤ جو پرانے نہیں ہوتے یعنی آسمان پر ایسا خزانہ جو خالی نہیں ہوتا۔" (لوقا، ۱۲ : ۳۲، ۳۳)

"اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال اسباب بیچ کر غریبوں کو دے دے اور میرے پیچھے ہو لے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔" (متی ۱۹ - ۲۱)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے، اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔" (متی ، ۱۹ : ۲۳-۲۴)

"اپنے لیے زمین میں مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے ...... بلکہ آسمان پر جمع کرو۔" (متی ، ۶ : ۱۹)

"اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہیں معاف کرے گا اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمہیں معاف نہ کرے گا۔"

(لوقا، ۶ : ۱۴-۱۵)

"میں تم سے کہتا ہوں کہ نہ اپنی جان کی فکر کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پیئیں گے - نہ اپنے بدن کے لیے کہ کیا پہنیں گے - کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بہتر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں - نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے - کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور تم لباس کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے

---

ۓ مسیح نے یہ حکم اس شخص کو دیا تھا جو متی، مرقس اور لوقا کے متفقہ بیان کے مطابق قتل، زنا، چوری اور جھوٹ سے پرہیز کرتا تھا، اپنے ماں باپ کی خدمت کرتا تھا، اور اپنے پڑوسی سے اپنے مانند محبت رکھتا تھا - مسیحؑ نے اس سے کہا کہ تو کامل اسی وقت ہو گا جب اپنا سارا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دے گا - (مؤلف)

درختوں کو دیکھو، کہ وہ کیسے بڑھتے ہیں۔ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ان میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو ضرور ہی پہنائے گا۔ اس لیے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے؟ کیا پئیں گے؟ (متی ۶: ۲۵-۳۱)

## تمدّن اور تہذیب سے کامل انقطاع

ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ آسمانی بادشاہت کی طرف لے جانے کے لیے مسیحیت جس ڈھنگ پر انسانی جماعت کی تربیت کرنا چاہتی ہے وہ تمدن اور تہذیب کے کامل انقطاع پر مبنی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ خاندانی تعلقات تمدنی زندگی کی بنیاد ہیں۔ جماعت سے انسان کا ابتدائی تعلق اپنے رشتہ داروں ہی کے واسطہ سے ہوتا ہے، انہی کے باہمی روابط سے ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے اور درحقیقت انسان کے لیے اخلاق کی بہترین درسگاہ بھی یہی ہے۔ مگر مسیحؑ کے تیشہ کا سب سے پہلا وار اسی اصل الاصول پر پڑتا ہے اور وہ سب سے پہلے اس رشتہ کو کاٹ دیتا ہے جو آدمی کو سوسائٹی سے منسلک کیے ہوئے ہے۔ دنیا کے برتنے اور اس کے معاملات میں حصہ لینے کے لیے سب سے پہلے جو شے انسان کو عمل پر مجبور کرتی ہے، وہ پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کی فکر ہے۔ لیکن مسیحؑ اس ابتدائی محرک ہی کو قتل کر دینا چاہتے ہیں تاکہ آدمی دنیا میں ویسی ہی زندگی بسر کرے جیسی ہوا کے پرندوں اور جنگلی سوسن کے درختوں کی ہے۔ انسان کی راحت و آسائش اور انفرادی و اجتماعی فلاح کے لیے مال و دولت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ مگر "مسیحؑ" کے نزدیک روحانی ترقی اور آسمانی بادشاہت کے لیے اس کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔ دنیا میں نظامِ امن و عدل کا قیام سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کے قانون پر منحصر ہے۔ مگر "مسیحؑ" کہتے ہیں کہ آسمانی باپ اس وقت تک تمہارے قصور معاف نہ کرے گا جب تک مکافاتِ عمل کے اس پورے قانون کو لپیٹ کر نہ رکھ دیا جائے۔ غرض یہ کہ "مسیحؑ" کے نزدیک دینداری دراصل ترکِ دُنیا کا نام ہے۔ جو شخص دنیا اور اس کے اسباب کو نہیں چھوڑتا، اجتماعی تعلقات کو قطع نہیں کرتا، دنیوی کاروبار کو ترک نہیں کرتا، اور کامل ترک و تجرید کی زندگی بسر نہیں کرتا، اس کے لیے آسمان کی بادشاہت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ انسان بیک وقت ان دونوں بادشاہتوں میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دین اور دُنیا دونوں کو پا لینا اس کے لیے ناممکن ہے۔ "مسیحؑ"

کے ارشاد کے مطابق "تم بیک وقت خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے"۔ یہ دو متضاد چیزیں ہیں، اس لیے جو ایک کا طالب ہو اسے دوسرے کی طلب چھوڑنی پڑے گی۔

## ایک مفسّرِ انجیل کا نقطۂ نظر

"مسیح" کی اس تعلیم کو خود مسیحی علماء جس رنگ میں پیش کرتے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے ریورینڈ ڈبلیو کی تفسیر انجیل کے چند فقرات یہاں نقل کر دینا کافی ہے۔ یہ تفسیر ۴۰ سے زیادہ مسیحی علماء کی مدد سے تیار کی گئی ہے اور انجیل کی بہترین تفاسیر میں سے ہے۔ اس کے مقدمے میں ایک مستقل مقالہ "تعلیماتِ مسیح" کے عنوان پر ہے جس میں لکھا ہے:

"مسیح نے انسانی سیرت کے لیے وہ طرز پسند کیا ہے جو بڑی حد تک دنیا کے پسند کیے ہوئے طرز سے مختلف ہے۔ خودداری کی بجائے فروتنی، اپنے حقوق پر جمے رہنے کے بجائے بدی کے آگے سر جھکا دینا اور وسعت طلبی کی جگہ قناعت، شرافت، عجز، صبر، ہمدردی، مصیبت میں خوش ہونا، درد سے راحت حاصل کرنا، یہ دنیا کو مسیحیت کے عطایا ہیں...... مگر ایک مسیحی کے کیرکٹر کی سب سے زیادہ جامع تعریف غالباً یہ ہے کہ وہ ایک یکسُو آدمی ہوتا ہے۔ وہ ایک پاؤں دنیا میں اور دوسرا دین (چرچ) میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ ایک ہی وقت میں خدا اور متاعِ دُنیا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتا......... مسیح کے نزدیک دنیا کے پاس انسان کو اپنی خدمت پر مجبور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دولت ہے، لہٰذا ایک مسیحی بننے کے لیے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ انسان دولت سے بے تعلق ہو جائے۔"[ل]

## فریضۂ استیصالِ شر سے مسیحیّت کا احتراز

اب یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مسیحیت میں محبت، عفو و درگزر اور تذلّل و انفعال کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ ایک ایسے اخلاقی نظام کے اجزا میں سے ہے جو رہبانیت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے اُخروی نجات کا راستہ دنیوی فلاح کے راستہ سے الگ اختیار کیا ہے۔ اس لیے وہ دنیا کے معاملات کو دنیا داروں پر چھوڑ دیتی ہے اور خود اپنے دینداروں کو لے کر الگ ہو جاتی ہے تاکہ گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر آسمانی بادشاہت حاصل کرنے کی تیاری کرے۔ ایسے مذہب میں جنگ نہ ہونے کے یہ معنی نہیں

ل COMMENTARY ON THE HOLY BIBLE, DUMELLEW P.L. XXX

ہیں کہ وہ دنیا اور اس کے معاملات کی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے اور اس کے باوجود ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قوت کے استعمال کی ضرورت نہیں سمجھتا، بلکہ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اس کو دین کے معاملات ہی سے کچھ تعلق نہیں ہے تو قدرتی طور پر جنگ و خونریزی سے بھی انکار ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ فساد فرو کرنے کے لیے تلوار کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ سرے سے اس کے استیصال ہی کی فکر فضول ہے، اس سے لڑنے کے بجائے تم اس کے آگے سر جھکا دو۔ وہ نہیں کہتا کہ ظلم و تعدی کے مقابلے میں حق کی حفاظت ہی نہ کرو، اگر ظالم تمہارا حق چھینتا ہے تو چھین لینے دو۔ وہ نہیں کہتا کہ مجرموں کو تشدد کے بغیر بھی سزا دی جا سکتی ہے اور مظلوموں کا قصاص قوت کے بغیر بھی لیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ تم سرے سے سزا اور قصاص ہی کو چھوڑ دو۔ اور کوئی "سات دفعہ نہیں سات کے ستر گُنے تک قصور کیے جائے تو اسے معاف کرتے رہو" غرض یہ کہ دنیا میں امن قائم کرنا، اس میں عدل و انصاف کی حکومت قائم کرنا، اور انسانیت کو ظلم و فساد کے تسلط سے نجات دلانا سب کچھ مسیحیت کے دائرہ عمل سے خارج ہے۔ اس نے اپنے لیے محکومی و مغلوبی اور مظلومی و منکوبی کی زندگی پسند کر لی ہے۔ اس لیے اگر وہ جنگ کی مخالف ہے اور بلا تمیزِ حق و غیر حق نفسِ جنگ ہی کو برا سمجھتی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایسی زندگی کے لیے یہی رویہ زیادہ موزوں ہے۔

## تذلّل و انفعال کی تعلیم کے مضمرات

لیکن سوال یہ ہے کہ تذلّل و انفعال کی یہ تعلیم کیا انسان کے لیے ایک دائمی اور عالمگیر قانون بن سکتی ہے؟ اس کا جواب مسیحیت خود اپنے منہ سے دے رہی ہے۔ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جنگ سے احتراز کا حکم خود کوئی مستقل قانون نہیں ہے بلکہ رہبانیت و ترکِ دُنیا کے ایک وسیع قانون کی دفعات میں سے ایک دفعہ ہے تو اس سے یہ بات خود بخود لازم آتی ہے کہ ترکِ جنگ کا قاعدہ اسی صورت میں نافذ ہو سکتا ہے جبکہ ترکِ دنیا کا پورا قانون نافذ ہو۔ مسیحیت خود بھی یہ نہیں کہتی کہ تم دنیا کا انتظام تو ضرور ہاتھ میں لو، مگر جنگ ہرگز نہ کرو۔ اس کی اپنی تعلیم کی رُو سے بھی انسان یہ عاجزانہ انفعالی زندگی اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جبکہ وہ دنیا کو چھوڑ دے اور اس کی مختلف تمدنی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو جائے۔ ان سب ذمہ داریوں کو قبول کرنے اور پورا کرنے کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ خود مسیحؑ کا یہ منشا ہے۔ اب اگر اس کو ایک عالمگیر قانون قرار دیا جائے تو لامحالہ ساری نوعِ انسانی کو تمدن و تہذیب

سے کنارہ کش ہو جانا پڑے گا۔ اگر انسان کو منزلِ مقصود "آسمانی بادشاہت" ہو اور یہ بھی مان لیا جائے کہ دنیوی زندگی کے تمام معاملات اس بادشاہت میں داخل ہونے سے روکتے ہیں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ نوعِ بشر پوری کی پوری اس منزل تک پہنچنے کے لیے اس روکنے والی چیز سے اجتناب کرے اور راہبانہ زندگی اختیار کر کے نفس کشی و ریاضت میں لگ جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ہونا غیر ممکن ہے۔ تمام دنیا بیک وقت اپنے کاروبار بند نہیں کر سکتی۔ معاش کی فکر چھوڑ کر "ہوا کے پرندوں" اور "جنگلی سوسن کے درختوں" کی سی زندگی اختیار نہیں کر سکتی۔ تجارت، صنعت، زراعت اور تمام دوسرے مشاغل کو ترک کر کے تعطل و بیکاری کی حالت قبول نہیں کر سکتی۔ حکومت اور اس کے انتظام کو چھوڑ کر خانقاہوں میں نہیں بیٹھ سکتی۔ اور اگر بفرضِ محال وہ ایسا کر بھی لے۔ تو ہرگز اس شرف و عزت کی مالک نہیں رہ سکتی جو اس کو اللہ تعالیٰ نے دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں عطا فرمایا ہے۔ بلکہ سچ یُوں ہے کہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ انسانی سوسائٹی کی یہ ایک ایسی حالت ہے جس کا متحقق ہونا ایک شاداب تخیل کے سوا کسی خارجی عالم میں ممکن نہیں ہے اور جو خدانخواستہ ممکن ہو بھی جائے تو کم از کم وہ کسی ذی عقل انسان کو مطلوب و مرغوب نہیں ہو سکتی۔ پس یہ کہنا بالکل بعید از عقل ہے کہ مسیحیت کا قانونِ اخلاق تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ایک دائمی اور عالمگیر قانون ہے کیونکہ عالمگیر اور دائمی قانون صرف وہی ہو سکتا ہے، جس پر تمام دُنیا کے باشندے ہر حالت میں عمل کر سکتے ہوں۔



## مسیحیت اجتماعی نظام کی نقیض ہے

پھر یہ قانون کسی ایک پوری قوم کے لیے بھی قابلِ عمل نہیں ہے۔ اگر کوئی قوم من حیث المجموع اس کی پابندی قبول کر لے اور "آسمانی بادشاہت" میں داخل ہونے کے لیے اس کی تمام ہدایات پر عمل پیرا ہونے لگے تو اس کو سب سے پہلے اپنی حکومت کا سارا نظام معطل کرنا پڑے گا۔ اپنی فوج اور پولیس منتشر کرنی ہوگی اور اپنی سرحدوں کی حفاظت اور قلعوں کی نگہبانی چھوڑنی پڑے گی۔ پھر جب اس کی کوئی ہمسایہ قوم میدان خالی دیکھ کر حملہ کر دے گی، تو مسیحی تعلیم کے مطابق یہ نیک نہاد قوم شریر کا مقابلہ نہ کرے گی، بلکہ ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی اور کُرتے کے ساتھ چوغہ بھی پیش کر دے گی۔ پھر وہ اپنی ساری دولت، اپنی تجارتی کوٹھیاں، اپنی دُکانیں، حتیٰ کہ اپنے گھروں کا مال و اسباب بھی چھوڑ دے گی، کیونکہ "دولت مند آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا" اور حکم ہے کہ "تو اپنا سارا مال بیچ کر خیرات کر دے"۔ اس کے بعد وہ

کسبِ معاش کے لیے محنت مزدوری کرنا بھی چھوڑ دے گی، اپنے کارخانے بند کر دے گی، صنعت، حرفت، خدمت سب کچھ ترک کر دے گی، اور اس کے تمام کاروباری آدمی اپنے اپنے کام چھوڑ کر صومعوں میں جا بیٹھیں گے، کیونکہ "تم خدا اور دولت دونوں کی ایک ساتھ خدمت نہیں کر سکتے اور مسیحؑ کا حکم ہے کہ "تم اپنی جان کی فکر نہ کرو"۔ آخر میں اس کے لیے صرف ایک ذریعۂ معاش رہ جائے گا کہ زمین کی کاشت کرے اور اپنی خوراک کے لیے غلہ حاصل کرے۔ لیکن آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کے لیے اسے یہ بھی چھوڑنا پڑے گا کیونکہ مسیحؑ کا ارشاد ہے کہ "ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں، نہ کاٹتے ہیں، پھر بھی تمھارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے"۔ اس طرح وہ قوم اپنی حکومت، اپنی زمین، اپنی دولت، اپنی صنعت و تجارت، غرض اپنا سب کچھ ان بیرونی حملہ آوروں کے سپرد کر دے گی جو "ایک کوس بیگار میں لے جائیں گے" تو یہ "دو کوس" جائے گی، وہ ظلم کریں گے اور یہ ان کے لیے دعا مانگے گی، وہ اس پر "لعنت" کریں گے اور یہ ان کے لیے "برکت" چاہے گی، وہ اس کی عزت و حرمت پر حملے کریں گے اور یہ انھیں خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی رہے گی۔ مسیحی نقطۂ نظر سے یہ اس کے اخلاق کا منتہائے کمال ہے جس کے بعد کوئی چیز اس کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتی، مگر عقل و دانش کے نقطۂ نظر سے یہ ایک قوم کی پستی و تنزل کا انتہائی درجہ ہے جس کے حصول کی کوشش کو ایک عقلمند آدمی خودکشی کے سوا کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ آخر وہ آسمانی بادشاہت ہے کس قسم کی جس میں ایسے ناکارہ لوگوں کی مانگ اور کھپت ہے۔ بہر حال جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس معنی میں دنیا کی کوئی قوم بھی مسیحیت کے قانونِ اخلاق کو اپنا قانونِ حیات نہیں بنا سکتی، کیونکہ اس کی فطرت اسے اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اس قانون کی ایک ایک دفعہ کو توڑنے پر مجبور کر دے گی اور عملاً اس کی خلاف ورزی کے بعد اعتقاداً اس پر ایمان رکھنا بے معنی ہو گا۔

## راہبوں اور سنیاسیوں کی ایک مختصر جماعت مسیحیّت پر چل سکتی ہے

تیسری صورت یہ ہے کہ اس کو ایک پوری قوم کے لیے بھی ہمہ گیر قانون نہ مانا جائے بلکہ ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص سمجھ لیا جائے، جیسا کہ خود مسیحؑ کی تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ صورت یقیناً ممکن العمل ہے۔ اگر انسانی جماعت کے مختلف گروہ اس کی مختلف ضروریات کو انجام دیتے رہیں، کوئی تجارت میں مشغول رہے، کوئی صنعت و حرفت کا کام کرے، کوئی زراعت کرتا رہے، تو یہ ممکن ہے کہ سوسائٹی اپنے

ایک قلیل حصّہ کو "ہوا کے پرندوں" اور "جنگلی سوسن کے درختوں" کی طرح بے عمل اور بیکار زندگی بسر کرنے کے لیے چھوڑ دے، اور اس کے چند افراد مسیحی اخلاق کے اس منتہائے کمال تک پہنچنے کی کوشش میں مشغول ہو جائیں جو ترکِ اسباب، قطع علائق، تذلّل و انفعال اور نفس کشی و خود انکاری سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر ایک مخصوص گروہ کے لیے اس قانون کو محدود مان لینے اور دوسری طرف اُسی کو برحق اور واحد ذریعۂ نجات تسلیم کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم نجات یا "آسمانی بادشاہت" پر راہبوں اور سنیاسیوں کی ایک مختصر جماعت کا اجارہ تسلیم کر لیں، اور یہ مان لیں کہ اس چھوٹی سی "بادشاہت" کے تنگ دائرے میں عالم انسانیت کے سوادِ اعظم کو جگہ نہیں مل سکتی۔ جو لوگ نظامِ تمدّن کو چلاتے ہیں، حکومت و سیاست کی تدبیر کرتے ہیں، قوم و ملک کی حفاظت میں جان لڑاتے ہیں اور مختلف انسانی ضروریات مہیا کرنے کے لیے مختلف قسم کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، ان کے لیے اس "بادشاہت" کے دروازے بند ہیں، کیونکہ مسیحیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان بیک وقت دنیا اور دین دونوں میں پاؤں نہیں رکھ سکتا اور "آسمانی بادشاہت" کا دروازہ اسی وقت کھل سکتا ہے، جب کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر مسیح کی بتائی ہوئی دینی زندگی اختیار کر لے۔ اس طرح صرف ایک مختصر سے گروہ کو "آسمانی باپ کی بادشاہت" میں داخل ہونے کا موقع ملتا ہے اور باقی اللہ کی ساری مخلوق اس سے محروم کر دی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ ان لوگوں کو بھی وہاں بار نہیں مل سکتا جو دنیا میں نیکی اور پاکیزگی کے ساتھ رہتے ہیں، قتل نہیں کرتے، زنا نہیں کرتے، چوری اور جھوٹ وغیرہ منہیات سے پرہیز کرتے ہیں، ماں باپ کی عزت کرتے ہیں، اپنے پڑوسی سے اپنے مانند محبت رکھتے ہیں مگر اپنا سارا مال بیچ کر خیرات نہیں کر دیتے۔

## مسیحیت پوری انسانیت کے لیے ذریعۂ نجات نہیں ہے

اس نظریہ کو صحیح مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم پھر پہلی صورت کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ "آسمانی بادشاہت" یعنی نجات کی منزل تک پہنچنے کا ذریعہ صرف مسیحیت کا قانونِ اخلاق ہی ہے، اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کرتا وہ اس بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا، تو پھر لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ نوعِ انسانی کے لیے ایک عالمگیر قانون ہے کیونکہ نجات ہر انسان کی منزلِ مقصود ہے، اور کسی راستہ کو اس تک پہنچنے کا واحد راستہ قرار دینا یہی معنی رکھتا ہے۔ کہ وہ تمام انسانوں کے لیے بنایا گیا ہے اور سب کو اس کی طرف دعوت دینا مطلوب ہے۔ لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس راستہ پر تمام

نوعِ انسانی کا جمع ہو جانا اور بالاتفاق کار بند ہونا عقلاً ناممکن ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحیت کا بنایا ہوا قانون جس طرح دائمی اور عالمگیر نہیں ہے اسی طرح برحق اور واحد ذریعۂ نجات بھی نہیں ہے[1]۔ عالمگیر، دائمی اور واحد ذریعۂ نجات تو صرف وہی قانون ہو سکتا ہے جس پر حاکم حاکم رہتے ہوئے، تاجر تاجر رہتے ہوئے، کسان کسان رہتے ہوئے اور ہر شخص اپنے اجتماعی و انفرادی فرائض ادا کرتے ہوئے عمل پیرا ہو سکتا ہو اور جس کی تعمیل میں کسی انسان کے لیے ناقابلِ عبور مشکلات، ناقابلِ برداشت خطرات و مصائب اور مالا یطاق تکالیف نہ ہوں۔ جو قانون ایسا نہیں ہے وہ نہ حق کا سیدھا راستہ ہے، نہ نجات کا واحد ذریعہ ہے نہ فطرت کا سچا قانون ہے۔

## فطرت کے بالکل خلاف

لیکن ہم اس نقطہ پر بھی نہیں ٹھیر سکتے۔ ہم کو ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہنا چاہیے کہ مسیحیت کا قانونِ اخلاق اپنی موجودہ شکل میں فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دراصل اخلاقی فضیلت کے ایک غلط تصور کا نتیجہ ہے جس میں بے اعتدالی کے ساتھ بعض فضائل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور بعض کو بلاضرورت معطل کر کے انسانیت کو مفلوج کر دیا گیا ہے۔ اس نے انسانی اخلاق کی جن خوبیوں پر زور دیا ہے ان کی فضیلت یقیناً مسلّم ہے۔ فروتنی، عجز و انکسار، عفو و درگزر، حلم و بردباری، صبر و تحمل کی فضیلت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ مگر تنہا انہی صفات پر انسانی زندگی کی تعمیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر دُنیا سے بدی و شرارت بالکل مٹ جائے اور شیطان اسے لے کر کسی اور کرّے میں چلا جائے تب تو یہ ممکن ہے

---

[1] اس اشکال کو خود مسیحیوں نے بھی محسوس کیا ہے اور اسی لیے یہ مسئلہ پیدا کیا گیا ہے کہ نجات کے لیے مسیحیت کے قانون پر پوری طرح عملدرآمد کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مسیحؑ نے خود صلیب پر چڑھ کر تمام اہلِ ایمان کا کفارہ ادا کر دیا، اور مسیحؑ اُن تمام لوگوں کے نجات دہندہ ہیں جو ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر اس مسئلہ کی کمزوری ظاہر ہے۔ اس کو تسلیم کر لینے کے بعد تو مسیحیت کے قانونِ اخلاق کی کوئی ضرورت باقی ہی نہیں رہتی۔ اگر یہ کفارہ کا عقیدہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی قتل کر کے، چوری اور زنا کر کے، ہمسائے کو ستا کر، اور حرام کی کمائی کے ڈھیر جمع کر کے بھی "آسمانی بادشاہت" میں داخل ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسیحؑ پر ایمان لے آئے۔ اس صورت میں وہ ساری اخلاقی تعلیم مہمل ہو جاتی ہے جو مسیحؑ نے اپنے مواعظ میں دی ہے، بلکہ خود مسیحؑ کا اپنا قول بھی غلط ہو جاتا ہے کہ ان اعمال کے ساتھ کوئی شخص آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر مسیحؑ کی یہ بات سچی ہے تو یقیناً کفارے کا یہ عقیدہ باطل ہے۔ بہر حال یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں اور عقل و منطق کی رُو سے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ صریح تناقض کے بغیر یہ دونوں ایک ہی مذہبی نظام کا جز بن سکیں۔ (مؤلف)

کہ انسان اپنی جسمانی قوت و شدت کا استعمال کیے بغیر اپنے حقوق، اپنی عزت اور خود اپنے وجود کی حفاظت کر سکے۔ لیکن جب دنیا میں نیکی کے ساتھ بدی بھی موجود ہے اور انسانی فطرت سے وہ شیطانی ملکات مٹ نہیں گئے ہیں جو ملکوتی فضائل کو مغلوب کرنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتے ہیں، تو ایسی صورت میں نیکی کو نہتا چھوڑ دینا اور اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو اس کی حفاظت کے لیے استعمال نہ کرنا صرف خودکشی ہی نہیں ہے بلکہ بدی و شرارت کی بالواسطہ امداد بھی ہے۔ حقیقتاً یہ کوئی نیکی ہی نہیں ہے کہ ظالموں کو عمداً ظلم کا موقع دیا جائے اور مفسدوں کو جان بوجھ کر فساد پھیلانے کی آزادی دیدی جائے۔ اس کو ہم کمزوری کہہ سکتے ہیں، بزدلی و کم حوصلگی سے موسوم کر سکتے ہیں، مگر خیر و صلاح اور نیکی و احسان سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ نیکی دراصل اصلاح کا دوسرا نام ہے، اور وہ محبت و غضب دونوں کے معتدل امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بدی کی اصلاح عفو و درگزر، صبر و تحمل اور لطف و رحم سے ہو سکے تو اسی سے کرنی چاہیے۔ اور اگر یہ محبت کی قوتیں اس میں کامیاب نہ ہو سکیں تو پھر سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کی قوتوں سے کام لینا ضروری ہے، کیونکہ اصل مقصود اصلاح ہے، اور انسان کا فرض ہے کہ ضرورت کی حد تک ہر اُس طریقے کو استعمال کرے جو اس مقصد کے حصول کے لیے مفید اور ناگزیر ہو۔ اس میں طریقوں کا امتیاز کرنا اور ایک ہی طریقہ پر اس حد تک اصرار کرنا کہ وہ اصلاح کے بجائے مزید فساد کا موجب ہو جائے نہ تو عقلمندی ہے اور نہ نیکی۔

## مسیحی نظریۂ محبت اور دوسرے انسانی فطری جذبات

مسیحیت کا یہ نظریہ کہ دین کا اصل الاصول "محبت" ہے اور اس کے سوا انسان کے تمام جذبات اور اخلاقی خصائص باطل ہیں جن کو مٹا دینے ہی سے دینداری کو نشو و نما حاصل ہو سکتا ہے، دراصل ایک غلط تخیل پر قائم ہے۔ اس نظریہ کے موجدوں کی نظر اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکی کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی چیز عبث نہیں پیدا کی ہے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ انسان کے اندر غضب، شہوت اور حُبِّ نفس وغیرہ جذبات خواہ مخواہ بلاضرورت پیدا ہو گئے ہیں اور انسانی زندگی میں شجاعت و خودداری، جرأت و شہامت، تدبر و سیاست، عدل و انصاف وغیرہ کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ انسان کے اندر جتنے ملکات و قُویٰ اور عواطف و جذبات ودیعت کیے گئے ہیں، سب کے سب اپنا ایک مصرف اور مدعا رکھتے ہیں۔ جس طرح انسان کا کوئی عضو حتیٰ کہ کوئی رونگٹا بھی بے کار

نہیں ہے، اُسی طرح انسان کی کوئی ذہنی و جسمانی قوت، اس کا کوئی ظاہری ملکہ اور کوئی نفسانی جذبہ و داعیہ بھی بے کار نہیں ہے۔ فاطرِ کائنات نے اس کو بغیر کسی مصلحت کے نہیں بنایا ہے۔ اگر یہ قوتیں غلط صورتوں میں ظاہر ہوں اور غلط راستے اختیار کرلیں تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ فی نفسہٖ غلط اور مذموم ہیں، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان نے اس کا صحیح مصرف نہیں سمجھا اور اس کے شعور نے اتنی ترقی نہیں کی کہ وہ ان کے صحیح استعمال کی طرف اس کی رہنمائی کرے۔ مثال کے طور پر شہوت ایک جذبہ ہے جس کی بدولت انسان نے اتنے گناہ کیے ہیں کہ شاید کسی اور جذبہ کے اثر سے نہ کیے ہوں گے، مگر اس کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو بالکل مٹا دینا چاہیے، کیونکہ اسی پر بقائے نوع کی بنیاد قائم ہے۔ حرص ایک جذبہ ہے جو انسان کو بندۂ غرض بنا کر بدترین گناہوں پر آمادہ کرتا ہے۔ مگر اس کو بالکل فنا کردینے کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہی چیز عمل کی اصل محرک ہے۔ غضب ایک جذبہ ہے جس نے دنیا میں بےشمار جھگڑے اور ظلم و ستم کرائے ہیں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ سراسر بدی ہی بدی ہے اور اس میں کوئی فائدہ متصور نہیں ہے، کیونکہ یہی چیز دنیا میں امن و امان کی ضامن ہے، ورنہ بدی و شرارت کی قوتیں اس کو تباہ کر ڈالیں۔ بالکل یہی حال اُن جذبات و ملکات کا ہے جو لطیف اور افضل سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں بہت سی خرابیاں بھی ہیں۔ شجاعت اگر حد سے بڑھ جائے تو تہور اور حماقت کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ دُور اندیشی اگر افراط کا پہلو اختیار کرے تو بزدلی اور نامردی بن جاتی ہے۔ رحم اگر اپنی قدرتی حدود میں نہ رہے تو جرائم و معاصی کا مددگار بن جاتا ہے۔ فیاضی اگر حد سے گزر جائے تو اسراف و تبذیر کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ کفایت شعاری اگر زیادہ ہوجائے تو بخل اور کنجوسی سے بدل جاتی ہے۔ محبت اگر اپنی حدود میں نہ رہے تو انسان کی عقل کو اندھا کردیتی ہے۔ مروت اگر بے موقع استعمال کی جائے تو بدکاریوں میں جسارت اور بےباکی پیدا کردیتی ہے۔ حلم و بُردباری اگر بے محل ہو تو گستاخی اور ظلم کی محرک بن جاتی ہے۔ فروتنی اور انکساری اگر بے محل ہو تو خودداری و عزتِ نفس خاک میں مل جاتی ہے۔ غرض یہ کہ نفسِ انسانی کو جتنی قوتیں عطا کی گئی ہیں سب اپنے اچھے اور بُرے دونوں پہلو رکھتی ہیں اور ان کے ایک ہی پہلو کو دیکھ کر نہ تو ان کی اچھائی یا بُرائی کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی کے ترک اور کسی کے اختیار کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔ جس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کے لیے صرف ہاتھ پاؤں اور قلب و دماغ ہی مفید ہیں، آنکھ، ناک، معدہ و جگر وغیرہ کی ضرورت

نہیں، محض قوتِ سامعہ اور لامسہ کافی ہے، باصرہ اور شامہ کی ضرورت نہیں۔ محض شعور و ادراک کفایت کرتا ہے، حافظہ اور تمیز کی ضرورت نہیں۔ بالکل اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسان میں صرف محبت و رحم، عفو و درگزر، عجز و فروتنی ہی کی ضرورت ہے، نفرت و غضب، شجاعت و شہامت، خودداری و عزتِ نفس، غیرت و حمیت وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر معدہ کی کمی کو جگر پورا نہیں کر سکتا، اگر دل کی جگہ دماغ کام نہیں دے سکتا، تو یقیناً غضب و انتقام کی جگہ محبت و رحم اور سیاست و تعزیر کی جگہ عفو و درگزر بھی مفید نہیں ہے۔ جس طرح بدن کی صحت کا انحصار تمام جسمانی قوتوں کے اعتدال پر ہے اور جس طرح صحتِ عقل اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب تمام قوائے ذہنی تناسب کے ساتھ اپنا اپنا کام کرتے رہیں، ٹھیک اسی طرح کمالِ اخلاق بھی اسی وقت متحقّق ہوتا ہے جب جذبات و خواہشات میں اعتدال ہو، نفس کی تمام قوتیں اپنے موقع و محل پر توازن کے ساتھ استعمال کی جائیں اور قدرت کے دیے ہوئے تمام ملکات کو اپنی حدود میں کام کرنے کا پوری طرح موقع دیا جائے۔ ایک فطری مذہب کا کام اسی اعتدال کی طرف رہنمائی کرنا ہے، نہ کہ بے اعتدالی کے جواب میں دوسری بے اعتدالی اور افراط کے مقابلہ میں تفریط پیدا کر دینا۔

## ظلمِ عظیم

مسیحیت اس حقیقتِ کبریٰ کے فہم سے قاصر رہی ہے۔ اسی لیے اس نے انسان کو ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم دی اور فیصلہ کر دیا کہ انسان محض تذلّل و انفعال ہی کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لے۔ مگر یہ نہ تو کمالِ اخلاق کا کوئی درجہ ہے اور نہ انسانیت کی کوئی خدمت۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ انسانیت پر ایک ظلمِ عظیم ہے۔ اس طریقِ زندگی کو اختیار کرنے والے ایک طرف اپنی ذات کو ان جائز لذتوں اور آسائشوں سے محروم کر دیتے ہیں جو اللہ نے ان کے لیے پیدا کی ہیں، اور دوسری طرف اپنے وجود کو بے کار و معطل کر کے انسانی جماعت کو اپنی خدمات سے محروم کر دیتے ہیں۔ مسیحیت نے دنیوی بادشاہت کو آسمانی بادشاہت سے الگ کر دیا ہے۔ خدا اور دولت دو متضاد قوتیں قرار دی ہیں اور سچے دینداروں کو حکم دیا ہے کہ وہ دولت کو چھوڑ کر خدا کے ہو جائیں اور دنیوی بادشاہت سے دست کش ہو کر صرف آسمانی بادشاہت کے ہو رہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نیک نہاد، شریف الطبع، دیندار، خدا ترس، ایماندار اور سچے لوگ تو دنیا کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں اور دنیا کا تمام کاروبار سوسائٹی کے اُن بدترین طبقوں کے ہاتھ میں چلا جائے جو خدا ترسی و

ایمانداری کے جوہر سے خالی ہوں ۔ حکومت پر جباروں اور ظالموں کا قبضہ ہو ۔ تجارت طماع اور بد دیانت لوگوں کے حصّہ میں آئے ۔ صنعت و حرفت پر دھوکہ باز اور جعلساز قابض ہو جائیں ۔ اور شر و فساد کی قوّتیں سوسائٹی کے سارے نظام کو خراب کر کے رکھ دیں ۔ جب وہ نیکو کار لوگ جو سوسائٹی کو صحیح راستہ پر چلا سکتے ہیں ، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے تو یقیناً بد کردار لوگ برسرِ کار آئیں گے ۔ اور ان کی بدکاریوں کی کم از کم آدھی ذمہ داری اُن نیکو کاروں پر بھی عائد ہوگی جنھوں نے ذمہ داریوں سے جی چرا کر میدانِ عمل کو بدمعاشوں کے لیے خالی چھوڑ دیا ۔ (۲۷)

فصل ۴

# مسیحؑ کی حقیقی تعلیمات کا تجزیہ



## موجودہ مسیحیت کے نقائص اور کوتاہیاں

اس بحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مسیحیت میں جنگ اور سیاست و تعزیر کا نہ ہونا اس کے کمال کی دلیل نہیں بلکہ نقص کی دلیل ہے۔

مسیحیت جس شکل میں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے وہ اتنے نقائص سے بھری ہوئی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کی پیروی دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکتی۔ لیکن مسیحیت اور اس کی تاریخ کے گہرے مطالعے سے ایک اور حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ جب ہم مسیحؑ کی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عقائد و اخلاق کی موٹی موٹی باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے، نہ ان کی کوئی شریعت ہے نہ کوئی مستقل ضابطۂ قوانین و اخلاق ہے، نہ حقوق و فرائض اور معاملات کے متعلق کسی قسم کی ہدایات ہیں، حتیٰ کہ عبادت کا بھی کوئی طریقہ متعین نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا مذہب کوئی مستقل مذہب نہیں ہو سکتا۔ عقائد اور چند اخلاقی ہدایات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہت سی ایسی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں جن کے لیے ایک مذہب کے پیروؤں کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہدایات کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جس مذہب میں یہ ہدایات موجود نہ ہوں اس میں ایک جداگانہ دینی نظام بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

## یہ ایک مستقل جداگانہ مذہب نہ تھا

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیحؑ نے ایسے ہی غیر مستقل مذہب کو ایک مستقل مذہب بنایا تھا؟ اور کیا مسیحؑ اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ ایسا مذہب تمام بنی نوع بشری بلکہ کسی ایک قوم کے لیے بھی ہر حالت میں، ہر زمانہ میں قابل عمل نہیں ہو سکتا؟ مسیحیت کے متبعین اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، مگر ہم جب مسیحیت کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان حالات پر نظر ڈالتے ہیں جن

میں وہ پیدا ہوئی تھی، اور ان اغراض کی تحقیق کرتے ہیں جن کے لیے وہ وجود میں آئی تھی تو ہمیں اس کا جواب کچھ اور ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسیحی مذہب خود کوئی مستقل مذہب نہ تھا، مگر موسوی شریعت کی تکمیل اور بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے پیدا ہوا تھا۔ موسوی شریعت جس زمانہ میں بھیجی گئی تھی وہ بنی اسرائیل کی ذہنی طفولیت کا زمانہ تھا۔ ان میں کسی گہری اخلاقی تعلیم کو قبول کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ نے ان کو ایک سادہ عقیدہ اور سیدھے سے ضابطۂ اخلاق کی تعلیم دے کر چھوڑ دیا تھا، جس میں اخلاقی فضائل، روحانی پاکیزگی اور ایمانی رُوح کی بہت کمی تھی۔ (۴۸)

## عیسائیت دینِ یہود کا تتمہ ہے

بس دینِ مسیحی ایک الگ دین نہیں ہے، بلکہ درحقیقت دینِ یہود کا ایک جُز اور زیادہ صحیح الفاظ میں اس کا تتمہ ہے۔ بالکل یہی بات خود انجیل میں حضرت مسیحؑ کی زبان سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توراۃ یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں، بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں توراۃ کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ بھی پورا ہوئے بغیر نہ ٹلے گا۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا، اور آدمیوں کو ایسا کرنے کی ہدایت کرے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا۔ لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور ان کی تعلیم دے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائے گا۔ پس میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر تمھاری راست بازی فقیہوں اور فریسیوں کی راست بازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو سکو گے۔ (متی ۵: ۱۷-۲۰۔ لوقا ۱۶: ۱۷)

ایک دوسری جگہ اپنے پیروؤں کو حکم دیتے ہیں۔

"فقیہ اور فریسی موسیٰؑ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس جو کچھ وہ تمھیں بتائیں سب عمل میں لاؤ اور مانتے رہو، لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا بھی مشکل ہے، دوسروں کے کندھوں پر رکھ دیتے ہیں مگر آپ انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔" (متی ۲۳: ۱-۴)

## یوحنا نے اپنی انجیل میں تصریح کی ہے کہ:

"شریعت موسیٰؑ کی معرفت دی گئی اور فضیلت و صداقت یسوع مسیح کی معرفت پہنچی۔" (۱: ۱۷)

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیت میں موسوی شریعت کے تمام احکام باقی رکھے گئے ہیں اور ان پر صرف فضیلت وصداقت کا اضافہ کردیا گیا ہے۔

## دعوت ناتمام رہی

مسیح کی بعثت کے وقت ان کی قوم سات آٹھ سو برس سے غیر قوموں کی غلامی میں مبتلا تھی۔ ان کی ولادت سے ۶۰ برس پہلے ہی روم کی فوج نے فلسطین پر حملہ کیا تھا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک پامال کرتی چلی گئی تھی۔ جس وقت مسیح نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی قید غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔

ان کا خاص وطن یہودیہ سنہ میں براہ راست رومی صوبہ داروں کے زیر انتظام آگیا تھا جو پروکیوریٹر PROCORATOR کہلاتے تھے۔ جب ان کی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز ہوا تو یروشلم کا پروکیوریٹر پونتوس پیلاطُس PONTIUS PILATE جیسا بے انصاف اور بے ضمیر شخص تھا۔ ان بے دین آقاؤں کی غلامی میں بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی حالت اس حد تک خراب ہوچکی تھی کہ وہ کلمۂ حق سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ مسیح کی آنکھوں کے سامنے گلیل کا رئیس ہیرودیس محض ایک رقاصہ کو خوش کرنے کے لیے حضرت یحییٰؑ JOHN THE BAPTIST کو قتل کراچکا تھا، اور خود مسیحؑ کی قدر وقیمت بھی ان کی قوم کی نگاہ میں جیسی کچھ تھی اس کا حال اس سے ظاہر ہے کہ آخر میں بنی اسرائیل نے برابا نامی ڈاکو کی جان کو مسیح کی جان سے زیادہ قیمتی سمجھا۔ ایسی حالت میں مسیح کے لیے کیونکر ممکن تھا کہ اپنی دعوت کے آغاز ہی میں جنگ کا جھنڈا لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور لڑ کر ایک آزاد دینی حکومت قائم کر دیتے۔

## یہود کو اخلاقی پستی سے نکالنے کی کوشش

وہ دیکھ رہے تھے کہ یہودیوں کی رُوح نکل چکی ہے۔ ان کی سیرت میں کوئی مضبوطی اور ان کی قومیت میں کوئی زندگی باقی نہیں ہے۔ اس لیے ان کا سب سے پہلا کام یہی تھا کہ اپنی قوم کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے سے نکالتے جس میں وہ گری ہوئی تھی اور اس میں فضیلتِ اخلاق کی وہ رُوح پھونکتے جس کے بغیر کوئی قوم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور دنیا میں اپنے آزاد وجود کو برقرار رکھنے پر قادر نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اوّل اوّل انہوں نے قومی سیرت کی تعمیر ہی کی طرف توجہ کی اور اپنے اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے وہ برابر کوشش کرتے رہے کہ اس تعمیری کام کے دوران میں کہیں حکومتِ وقت سے تصادم کا موقع نہ آجائے۔ کیونکہ اگر ابتدا ہی میں حکومت سے مقابلہ شروع ہوجاتا تو اصل اصلاحی کام بھی نہ ہوتا اور اس کے

انجام پائے بغیر حکومت کے مقابلے میں بھی ناکامی ہوتی۔ اسی لیے انھوں نے حکومت کے ساتھ تصادم کرنے سے انتہائی پہلوتہی کی، اور جب یہودی علماء کے شاگردوں نے ان کو پکڑوانے کے لیے مسئلہ پوچھا کہ قیصر کو ہم ٹیکس دیں یا نہیں تو انھوں نے ذومعنی جواب دے کر ٹال دیا کہ:

"جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔" (لوقا، ۲۰: ۲۲)

انھوں نے حکم دیا کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو، جو تم پر ظلم کرے اسے دعا دو اور اس کے لیے برکت چاہو، جو تمھیں بیگار میں پکڑے اس کے ساتھ ایک کوس کے بجائے دو کوس جاؤ، جو تمھارا کرتہ چھینے اس کو چوغہ بھی اتار دو، جو تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ ابتداءً ان سب احکام کا مُدعا یہ تھا کہ حکومت سے تصادم نہ ہو اور قوم میں مصیبت جھیلنے کی قوّت پیدا ہو جائے۔

## تعلیمِ صبر و استقامت

اس کے بعد انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی قوم کو استقامت، صبر، تحمل، بے خوفی کی تعلیم دینی شروع کی، ان کو مصائب و شدائد کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا اور ان کے دل سے موت کا خوف اور حاکمانہ قہر و طاقت کا ڈر نکالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ:

"جب تم حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے پیش کیے جاؤ اور تمھیں اذیتیں دی جائیں تو اس وقت ثابت قدم رہنا۔" (مرقس، ۱۳)

انھوں نے جان کی محبت دلوں سے نکالنے اور مرنے کی آمادگی پیدا کرنے کے لیے کہا:

"جو کوئی اپنی جان بچانا چاہے وہ اسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئے گا وہی اسے بچائے گا۔" (لوقا، ۹: ۲۴)

انھوں نے حکومت اور اس کی عنایت پر بھروسہ رکھنے کے بجائے خدا اور اس کی رزاقی پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دی تاکہ غلامی کی وہ سب سے بڑی کمزوری دُور ہو جو ایک غلام قوم کو حکمران قوم کے طلسم میں گرفتار رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ:

"جب تم بُرے ہو کر اپنی اولاد کو اچھی چیزیں دیتے ہو تو تمھارا آسمانی باپ اپنے مانگنے والوں کو ضرور دے گا۔" (لوقا، ۱۱: ۱۳)

انھوں نے حکومت کا رُعب دلوں سے دُور کرنے کی کوشش کی اور ان کو بتایا کہ جو لوگ محض جسم کو

قتل کر سکتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کر سکتے، اُن سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اصل میں ڈرنے کے قابل وہ ہے جو رُوح اور جسم دونوں پر ہلاکت طاری کر سکتا ہے۔ (لوقا، ۱۲: ۴-۵)

یہ سب باتیں ایک صدیوں کی غلام قوم میں آزادی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ضروری تھیں، اور ابتداً مسیحؑ نے انہی تک اپنی تعلیم کو محدود رکھا۔

## آخری دور میں جہاد کی ناتمام تعلیم

اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد آخری زمانہ میں وہ جہاد و قتال کے مضمون کی طرف بڑھ رہے تھے اور کبھی کبھی اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کی خواہش بھی ظاہر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:

"میرے ان دشمنوں کو جنھوں نے نہ چاہا کہ میں اُن پر بادشاہی کروں یہاں لاکر میرے سامنے قتل کرو۔"

اسی طرح انھوں نے اپنے متبعین کو تلوار رکھنے کا حکم بھی دے دیا تھا جیسا کہ لوقا نے لکھا ہے:

"اس نے اُن سے کہا کہ اب جس کے پاس بٹوا ہو وہ اسے لے، اور اسی طرح جھولی بھی، اور جس کے پاس نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے..... انھوں نے کہا کہ اے خداوند، دیکھ یہاں دو تلواریں ہیں، اس نے کہا بہت ہیں۔" (۲۲: ۳۶-۳۸)

لیکن مسیحؑ کو اپنی قوم کی ہدایت و راہنمائی کے لیے صرف ڈھائی تین سال کی مدت نصیب ہوئی اور یہ مختصر مدت ایک پوری قوم کو جہاد فی سبیل اللہ کے قابل بنانے کے لیے کافی نہیں تھی۔ اس عرصہ میں نہ تو ان کے پیروؤں کی تعداد اس حد تک پہنچی تھی کہ وہ رومیوں کے مقابلہ پر ان سے کام لے سکتے اور نہ خود ان لوگوں کی، جو اُن کے پیرو ہو چکے تھے، اخلاقی تربیت اس قدر مکمل ہوئی تھی کہ وہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوںؓ کی طرح جرأت و عزیمت کے ساتھ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرتے، گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر جاتے اور بڑی سے بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں بھی بے خوف ہو کر جانیں لڑا دیتے۔ ان لوگوں کے ایمان ابھی اتنے قوی نہ ہوئے تھے کہ وہ علانیہ اظہارِ حق کی جرأت کرتے۔ مسیحؑ کے سب سے زیادہ محبوب اور معتمد علیہ حواری پطرس کا یہ حال تھا کہ اُن کی گرفتاری کے وقت جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تم بھی مسیحؑ کے پیرو ہو تو اس نے "مرغ کے دو دفعہ بانگ دینے سے پہلے تین دفعہ مسیحؑ کا انکار کر دیا (مرقس ۱۴: ۷۲)۔

ان کے ایک اور حواری یہوداہ اسکریوتی نے چاندی کے ۳۰ سکوں کی خاطر ان کو گرفتار کرا دیا (متی ۲۶: ۱۴-۱۶)

اور جب ان کو گرفتار کر لیا گیا تو ان کے سارے شاگرد انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے (متی ۲۶ : ۵۶) ظاہر ہے کہ جب ان کے خاص حواریوں اور بھروسہ کے شاگردوں کا یہ حال تھا تو وہ ایسی ناقابلِ اعتماد فوج کو لے کر جہاد کی جرأت کیونکر کر سکتے تھے۔ اگر رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ان کو بھی تعلیم و تربیت کا کافی موقع ملتا تو ممکن تھا کہ وہ بھی اپنے حواریوں میں وہی مجاہدانہ رُوح پیدا کر دیتے جو صحابہؓ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کی تھی۔ لیکن ان کی سرکش قوم نے ان کی نبوت کو پورے تین سال بھی برداشت نہ کیا اور انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اس کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی بڑا کام کر سکتے۔ اس قلیل مدت میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کام ہو سکتا تھا۔ جتنا مسیحؑ نے کیا۔ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے ابتدائی تین برسوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی کہیں جہاد و قتال کا نشان نہ ملے گا۔ وہی صبر و تحمل، ثبات و استقامت، تقویٰ و خشیت، توکل علی اللہ اور تزکیۂ نفس و تنزیہہ اخلاق کی تعلیمات وہاں بھی پائی جائیں گی جو مسیحؑ کی حیاتِ نبویہ میں پائی جاتی ہیں۔

## مسیحیت اور موسوی شریعت کا تعلق

اس علم و بصیرت کی روشنی میں اگر مسیحؑ کی تعلیمات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہو جائیں گی۔

ایک قسم وہ ہے جس میں مسیحؑ نے شریعتِ موسویہ کی تکمیل کی ہے اور اس میں ضروری اضافے کیے ہیں، موسوی شریعت میں رافت و رحمت اور شفقت و لینت کی کمی تھی۔ مسیحؑ نے اس کا اضافہ کیا۔ اس کے قوانین میں لچک بالکل نہ تھی اور اس کی تعلیمات میں انسانی برادری کا وسیع تخیل بہت دھندلا تھا۔ مسیحؑ نے اس کمی کو پورا کیا اور بنی اسرائیل کو تمام بنی نوعِ انسان کے ساتھ یکساں محبت کرنے کی تلقین کی۔ اس میں انسان کے محض فرائض پر زور دیا گیا تھا اور احسان یا فضیلتِ اخلاق کے حصہ کو اچھوتا چھوڑ دیا گیا تھا، مسیحؑ نے سب سے زیادہ اسی پہلو پر زور دیا اور خیرات، فیاضی، ہمدردی، ایثار اور لطف و رحم وغیرہ فضائل کی خصوصیت کے ساتھ تلقین کی۔ مسیحؑ کی تعلیم کا یہ حصہ خود کوئی مستقل قانون نہ تھا بلکہ موسوی شریعت کا تتمہ اور ایک ضروری ضمیمہ تھا۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں مسیحؑ نے اپنے زمانہ کے بنی اسرائیل کی مخصوص اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی حالت کو پیشِ نظر رکھ کر اصلاح کی کوشش کی تھی۔ مثلاً یہودیوں میں مال و دولت کی حرص اور دنیا کی محبت بڑھی ہوئی تھی۔ مسیحؑ نے اس کے مقابلہ میں قناعت و توکل اور متاعِ دُنیا کی تحقیر پر زور دیا۔ یہودیوں میں

بے رحمی، سنگدلی اور شقاوت کی زیادتی تھی۔ مسیحؑ نے اس کے جواب میں عفو و درگزر اور رحم کی تلقین کی۔ یہودیوں میں کنجوسی اور تنگ دلی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ مسیحؑ نے اس کی اصلاح کے لیے سخاوت و فراخ حوصلگی کا درس دیا۔ یہودی امراء و فقہا خود پسند، نفس پرست، متکبر اور مغرور تھے۔ مسیحؑ نے ان کو اعتدال پر لانے کے لیے فروتنی، انکسار، زہد و تقویٰ اور خدا پرستی پر زور دیا۔ یہودی قوم رومی حکومت میں غلام، بے بس اور کمزور تھی۔ مسیحؑ نے ان کی سلامتی اور نجات کے لیے انھیں ایک طرف حکومت کے مقابلہ سے روکا، ظلم و تعدی کو برداشت کرنے کی تلقین کی، حقوق کی حفاظت میں قوت استعمال کرنے سے منع کیا اور دوسری طرف ان میں جنگ کی معنوی قوت پیدا کرنے کے لیے صبر و استقامت، بے خوفی اور پختگی عزم و ارادہ کی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسیحؑ کی تعلیم کا یہ دوسرا حصہ بنی اسرائیل کی خاص اسی حالت کے لیے مخصوص تھا جس میں بعثتِ مسیحؑ کے وقت وہ مبتلا تھے۔ اس کو کوئی دائمی اور عالمگیر قانون بنانا ہرگز مقصود نہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ تذلل و انفعال کی یہ تعلیم کہ شریر کا مقابلہ نہ کر، جو کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے آگے دوسرا گال بھی پیش کر دے، جو کوئی تیرا کُرتہ چھینے، اسے چوغہ بھی اُتار دے، یہ دراصل غلامی و بے بسی کی ایک مخصوص حالت کے لیے تھی، اس کو کسی آزاد قوم کی سیاسی پالیسی بنانا نہ تو مطلوب تھا اور نہ یہ کسی طرح درست اور معقول ہو سکتا تھا۔ (۲۹)

# باب ۳



# حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں تحریف

# فصل ا

# مسیحیت کا ظہور

وَمِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓی اَخَذْنَا مِیْثَاقَھُمْ (المائدہ۔ آیت ۱۴)

ترجمہ:۔ "اسی طرح ہم نے ان لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔"

لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ "نصاریٰ" کا لفظ ناصرہ سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السلام کا وطن تھا۔ دراصل اس کا ماخذ "نصرت" ہے اور اس کی بنا وہ قول ہے جو مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں؟) کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں) عیسائی مصنفین کو بالعموم محض ظاہری مشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ (NAZARENES) کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا، اور جنھیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ابیونی کہا جاتا تھا، انہی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انھوں نے خود کہا تھا کہ ہم "نصاریٰ" ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے اپنا نام کبھی ناصری نہیں رکھا۔

## موسوی شریعت سے جدائی

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروں کا نام کبھی "عیسائی" یا "مسیحی" نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے نام سے کسی نئے مذہب کی بنا ڈالنے نہیں آئے تھے۔ ان کی دعوت اُسی دین کو تازہ کرنے کی طرف تھی، جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن سے پہلے اور بعد کے انبیا علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے عام بنی اسرائیل اور پیروانِ شریعتِ موسوی سے الگ نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ اس کا کوئی مستقل نام رکھا۔ ان کے ابتدائی پیرو خود بھی نہ اپنے آپ کو اسرائیلی ملت سے الگ سمجھتے تھے، نہ ایک مستقل گروہ بن کر رہے، اور نہ انھوں نے اپنے لیے کوئی امتیازی نام اور نشان مقرر کیا۔ وہ

عام یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس ہی کے ہیکل میں عبادت کرنے کے لیے جاتے تھے اور اپنے آپ کو موسوی شریعت پر عمل کرنے کا پابند سمجھتے تھے۔ (ملاحظہ ہو کتاب اعمال ۳:۱ - ۱۰:۱۴ - ۱۵:۱-۵ - ۲۱:۲۱)

## جدائی کا دوطرفہ عمل

آگے چل کر جدائی کا عمل دو جانب سے شروع ہوا۔ ایک طرف حضرت عیسیٰؑ کے پیروؤں میں سے پولوس (سینٹ پال) نے شریعت کی پابندی ختم کر کے یہ اعلان کر دیا کہ مسیحؑ پر ایمان لے آنا نجات کے لیے کافی ہے اور دوسری طرف یہودی علماء نے پیروانِ مسیحؑ کو ایک گمراہ فرقہ قرار دے کر عام بنی اسرائیل سے کاٹ دیا لیکن اس جدائی کے باوجود ابتداءً اس نئے فرقے کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ خود پیروانِ مسیحؑ اپنے لیے کبھی "شاگرد" کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کبھی اپنے رفقاء کا ذکر "بھائیوں" (اخوان) "ایمان داروں" (مومنین) "جو ایمان لائے" اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا اور "مقدسوں" کے الفاظ سے کرتے تھے۔ (کتاب اعمال ۲:۴۴ - ۴:۳۲ - ۹:۲۶ - ۱۱:۲۹ - ۱۳:۵۲ - ۱۵:۱ - ۲۲:۱۱ - رومیوں ۱۵:۲۵ کلسیوں ۱:۲) بخلاف اس کے یہودی ان لوگوں کو کبھی "گلیلی" کہتے تھے اور کبھی "ناصریوں کا بدعتی فرقہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ (اعمال ۲۴:۵ - لوقا ۱۳:۲)۔

یہ نام دھرنے کی کوشش انہوں نے ازراہِ طنز و تشنیع اس بنا پر کی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وطن ناصرہ تھا اور وہ فلسطین کے ضلع گلیل میں واقع تھا۔ لیکن یہ طنزیہ الفاظ اس حد تک رائج نہ ہو سکے کہ پیروانِ مسیح کے لیے نام کی حیثیت اختیار کر جاتے۔

## لفظ "مسیحی" کا اوّلین استعمال

اس گروہ کا موجودہ نام مسیحی (CHRISTIAN) پہلی مرتبہ ۴۳ء یا ۴۴ء میں انطاکیہ کے مشرک باشندوں نے رکھا تھا، جب کہ سینٹ پال اور برنباس نے وہاں پہنچ کر اپنے مذہب کی تبلیغِ عام شروع کی (اعمال ۱۱:۲۶) یہ نام بھی دراصل طنز و تمسخر کے طور پر مخالفین کی طرف سے رکھا گیا تھا، اور پیروانِ مسیحؑ اسے خود اپنے نام کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن جب ان کے دشمنوں نے ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا تو ان کے لیڈروں نے کہا کہ اگر تمہیں مسیح کی طرف نسبت دے کر "مسیحی" کہا جاتا ہے تو تمہیں اس پر شرمانے کی کیا ضرورت ہے (۱- پطرس ۴:۱۶) پس اس طرح رفتہ رفتہ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو اسی نام

سے موسوم کرنے لگے جس سے ان کے دشمنوں نے طنزاً انھیں موسوم کیا تھا، یہاں تک کہ آخر کار ان کے اندر سے یہ احساس ہی ختم ہو گیا کہ یہ دراصل ایک بُرا لقب تھا جو انھیں دیا گیا تھا۔

## عیسائیوں پر قرآن کا ایک احسان

قرآن مجید نے اسی لیے مسیحؑ کے ماننے والوں کو مسیحی یا عیسائی کے نام سے یاد نہیں کیا، بلکہ انھیں یاد دلایا ہے کہ تم دراصل ان لوگوں کے نام لیوا ہو جنھیں عیسیٰؑ ابن مریم نے پکارا تھا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کرے"۔ اور انھوں نے جواب دیا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ "ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں" اس لیے تم اپنی ابتدائی اور بنیادی حقیقت کے اعتبار سے نصاریٰ یا انصار ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنری اس یاد دہانی پر قرآن کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے الٹی شکایت کر رہے ہیں کہ قرآن نے ان کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے کیوں موسوم کیا۔ (۳۰)

## سینٹ پال نے ایک نیا دین بنا ڈالا

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے تھے، عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لائے تھے اور وہ اُن کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہوا تو اُس نے رومیوں، یونانیوں اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی، اور اس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰؑ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی بلکہ اُن کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیروؤں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اُس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اس وقت بھی اُس نے حضرت عیسیٰؑ کے کسی قول کی سند پیش نہیں کی بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا۔

## نئے دین سے سینٹ پال کا مقصد

اس نئے دین کی تشکیل میں اس کے پیش نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودی (GEN-TILE) دنیا قبول کر لے۔ اس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی، شریعت یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے

اس نے کھانے پینے میں حرام وحلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔ حتیٰ کہ اس نے مسیحؑ کی اُلُوہیت اور ان کے ابنِ خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولادِ آدم کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت مناسبت رکھتا تھا۔

## اس فتنہ کی روک تھام میں پیروانِ مسیحؑ کی ناکامی

مسیحؑ کے ابتدائی پیروؤں نے ان بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھہر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیحؑ کی اُلُوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز ۳۲۵ء میں نیقیہ NICAEA کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مسلّم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھہرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس ATHANASIUS کے ایک خط کے ذریعے معتبر ومسلّم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء میں پوپ ڈیمیسس DAMASIUS کے زیرِ صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس GELASIUS نے اس مجموعہ کو مسلّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُن کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جو کلیسا کی نگاہ میں غیر معتبر تھیں۔ لیکن کلیسا کے جو عقائد مسلّم قرار دیے گئے تھے اُن کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکا ہے کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔ (۳۱)

## تعلیماتِ عیسیٰؑ کو بالکل ملیامیٹ کر دیا گیا

لیکن مسیحؑ کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے چند ہی برس بعد ان تمام اصول وقواعد کو یکلخت منہدم کر دیا گیا جن پر انھوں نے اپنی دینی تجدید واصلاح کی بنیاد رکھی تھی۔ اور مسیحؑ کی اصل تعلیم کو ایسا بدل دیا گیا کہ دنیا میں اس کے وجود کا نام ونشان تک نہ رہا۔ اس عمل تحریف وتنسیخ کا محرک سینٹ پال (پولوس) تھا ہم اس

کی نیت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے کہ مسیح کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی ۶ برس تک ان کی دعوت کا شدید دشمن رہنے کے بعد آخر کار وہ سچے دل سے مسیح کا پیرو اور وکیل بن گیا ہو۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسیح کا صحبت یافتہ نہ تھا، ان کی تربیت میں رہ کر اسے تعلیماتِ مسیح کی اصل رُوح کو سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا، اور وہ ان حواریوں کے مقابلہ میں جو مسیح کے زیرِ تربیت رہ چکے تھے۔ مسیحی تعلیمات کو زیادہ سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس لیے جب اس نے پطرس جیسے حواریوں کی رائے کے خلاف مسیح کے دین کی تعبیر و تاویل کی اور اسے اپنی نوایجاد بنیادوں پر قائم کیا، تو یہ بدنیتی نہ سہی، جہل و ناواقفیت کی بنا پر یقیناً ایک کھلی ہوئی تحریف تھی۔[1]

## اصولِ دین میں پہلی تحریف

اس سلسلہ میں پولوس نے دین کے اصول میں جو تحریفات کیں ان میں سب سے پہلی تحریف یہ تھی کہ مسیح کی تعلیم کو تمام عالمِ انسانی کے لیے ایک عام پیغام قرار دیا، حالانکہ دراصل وہ محض بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ مسیح نے اپنی زندگی میں جب حواریوں کو تبلیغ و دعوت کے لیے بھیجا تھا تو صاف طور پر حکم دیا تھا کہ:

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں ہی کے پاس جانا۔" (متی، ۱۰: ۵-۶)

خود مسیح نے اپنے پورے عہدِ نبوت میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غیر اسرائیلی قوموں کو اپنی طرف دعوت نہیں دی اور نہ کسی غیر اسرائیلی کو داخلِ جماعت کیا۔ سینٹ پال کے ظہور سے پہلے مسیح کے حواری بھی اسرائیلیوں ہی کو دعوت دیتے رہے۔ مبلغ بھی اسرائیلی تھے اور اُن کے مخاطب بھی اسرائیلی۔ اس وقت تک مسیحی دعوت یہودی مذہب میں ایک اصلاحی دعوت شمار ہوتی تھی۔ حواریوں میں یہ ایک مسلم مسئلہ تھا کہ انجیل کی منادی صرف

---

[1] خود سینٹ پال کے شاگرد لوقا کی کتاب "اعمال" سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کی زندگی میں اس کو اُن کی صحبت اور تربیت سے فائدہ اُٹھانے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ نیز یہ کہ جب اس نے دینِ مسیح میں تحریف شروع کی تو مسیح کے خاص تربیت یافتہ حواریوں نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ پس خود انجیل کی سند پر کہا جا سکتا ہے کہ سینٹ پال کے ایجاد کردہ اصول نہ صرف دینِ مسیح کی اسپرٹ کے خلاف تھے بلکہ خود مسیح کی صریح ہدایات کے بھی خلاف تھے۔ (مؤلف)

[2] MILLMAN, HISTORY OF CHRISTIANITY VOL. I P. 377

ان لوگوں کے لیے ہے جو شریعتِ موسویہ کے پیرو ہیں[1]۔ پیروانِ مسیحؑ کی جو مؤتمر عام ۴۹ء میں بمقام یروشلم منعقد ہوئی تھی اس میں ایک بڑی جماعت اسی رائے کی مؤید تھی[2]۔ لیکن پولوس نے دعوتِ مسیحؑ کی حقیقت، مسیحؑ کی تصریحات اور حواریوں کے علم و یقین، سب کو نظر انداز کر کے یہ فیصلہ کیا کہ مسیحؑ کی دعوت تمام دنیا کی قوموں کے لیے ہے، اور اس فیصلہ کو حق بجانب قرار دینے کے لیے یہ دعویٰ کیا کہ مسیحؑ نے صلیب پر چڑھنے اور وفات پا جانے کے بعد اپنے شاگردوں کے پاس آ کر یہ حکم دیا تھا کہ "تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ" (متی ۲۸:۱۹)

## اصولِ دین میں دوسری تحریف

لیکن غیر اسرائیلی قوموں کو موسوی قوانین کا پابند بنانا مشکل تھا۔ بہت سے رسوم و شعائر ایسے تھے جن سے ان قوموں کو نفرت تھی۔ اس لیے فوراً ہی یہ سوال پیدا ہو گیا کہ جب ان قوموں کو مسیحیت کی طرف دعوت دی جائے تو موسوی شریعت کی پابندی پر زور دیا جائے یا نہیں؟ اس بارے میں مسیحؑ کی تصریحات بالکل واضح تھیں۔ وہ فرما چکے تھے کہ "زمین و آسمان ٹل سکتے ہیں مگر تورات کا ایک شوشہ اور ایک نقطہ بھی نہیں ٹل سکتا" اور یہ کہ "میں تورات کو منسوخ کرنے کے لیے نہیں بلکہ تکمیل کرنے آیا ہوں" اور "آسمان کی بادشاہت میں وہی داخل ہو سکتا ہے جو تورات کے حکموں پر عمل کرے"۔ ان تصریحات کے بعد کسی سچے مسیحی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ مسیحیت کو موسوی شریعت سے الگ کرتا۔ مگر پولوس نے ان کے علی الرغم یہ فیصلہ کیا کہ ہر غیر اسرائیلی مسیحی بن سکتا ہے خواہ شریعت پر عمل کرے یا نہ کرے[3]۔ چنانچہ وہ تمام غیر اسرائیلی مشرکین جو شریعتِ موسویہ کے کلی و جزوی طور پر منکر تھے، مسیحیت میں داخل کر لیے گئے۔

## شریعتِ موسوی کی مخالفت

اس ترمیم و تنسیخ پر عام ناراضی کا اظہار کیا گیا (اعمال باب ۲۱) اور خود مسیحی جماعت کے اعیان نے بھی اس کی سخت مخالفت کی، مگر پولوس نے سینٹ پیٹرس اور سینٹ برناباس جیسے جلیل القدر حواریوں کو ریاکار اور گمراہ قرار دیا (گلتیون ۲:۱۳) اور علی الاعلان شریعتِ موسویہ کی مخالفت شروع کر دی۔ وہ گلتیون کے

---

۱ DUMELLOW, COMMENTARY ON THE HOLY BIBLE, P.L. XXXIX

۲ MILMAN, HISTORY OF CHRISTIANITY VOL. I P. 393

۳ DUMELLOW, COMMENTARY ON THE HOLY BIBLE P.LXXXIX

۴ MILLMAN, HISTORY OF CHRISTIANITY VOL. I P. 392

نام اپنے خط میں لکھتا ہے:

"ہم یہ جان کر یسوع مسیح پر ایمان لائے کہ آدمی شریعت کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے برحق ٹھیرتا ہے...... شریعت کے اعمال سے کوئی بشر برحق نہ ٹھیرے گا...... حقانیت اگر شریعت ہی کے وسیلے سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا۔" (۲: ۱۶-۲۱)

"جو لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں سب لعنت کے ماتحت ہیں..... شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھیرتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ راست باز ایمان سے جیتا رہے گا۔ اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں..... مسیح نے ہمارے لیے لعنتی بن کر اور ہمیں خرید کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔" (۳: ۱۰-۱۳)

"شریعت، ایمان (یعنی مسیح کی تعلیم) تک پہنچانے کے لیے ہماری اُستاد بنی تاکہ ہم ایمان کے سبب راست باز ٹھیریں۔ مگر جب ایمان آچکا تو ہم اُستاد کے ماتحت نہ رہے۔" (۳: ۲۴-۲۵)

"مسیح نے ہمیں آزاد رہنے کے لیے آزاد کیا ہے۔ پس قائم رہو اور دوبارہ غلامی یعنی شریعت کی پابندی کے جوئے میں نہ جتو..... تم جو شریعت کے وسیلہ سے راست باز بننا چاہتے ہو تو گویا تم مسیح سے الگ ہو گئے اور فضل سے محروم، کیونکہ ہم رُوح اور ایمان کے توسّل سے راستبازی کی اُمید بر آنے کے منتظر ہیں۔" (۵: ۱-۵)

اس طرح مسیحیت شریعت سے الگ ہو گئی۔ تمدن، معاشرت، سیاست اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے متعلق تمام قوانین منسوخ ہو گئے۔ اور صرف چند اخلاقی و روحانی تعلیمات کے ایک نامکمل مجموعہ کو، جو دراصل شریعت کے ضمیمہ کے طور پر ایک خاص قوم کی خاص حالت کو درست کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا، ایک مستقل، دائمی اور عالمگیر مذہب بنا دیا گیا۔

## پولوسی مسیحیت کے مضر اخلاقی اثرات

سینٹ پال کے مقلدوں نے اس غیر مکمل مذہب کو جو دراصل مسیحی نہیں، بلکہ پولوسی مذہب تھا، بنی اسرائیل کو چھوڑ کر روم و یونان کی آزاد قوموں میں پھیلانا شروع کیا۔ لیکن کسی شریعت اور کسی ضابطۂ قانون کے بغیر محض ایک اخلاقی تعلیم اور ایسی تعلیم جو دراصل ایک غلام اور پسماندہ قوم کے لیے وضع کی گئی تھی، آزاد اور صاحب حکومت و سیاست قوموں کے لیے بیکار اور بے معنی چیز تھی۔ اس میں کوئی ایسی مکمل ہدایت نہ

تھی ہی نہیں کہ عام انسانی جماعت کے مختلف حالات میں مفید و مناسب ہو سکتی۔ وہ تو صرف چند اخلاقی نصائح کا مجموعہ تھی جو زیادہ تر انتہا پسندانہ تخیلیں اور ظاہر ہے کہ تنہا ان پر عمل کر کے کسی قوم کا زندہ رہنا محال تھا، لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی ڈھائی تین سو برس تک تو عیسائی ہر قسم کے مظالم و شدائد کے تختۂ مشق بنتے رہے۔ کیونکہ یہی اخلاق ان کو سکھایا گیا تھا اور اس منزل سے آگے چلنے کے لیے ان کے پاس کوئی ہدایت نہ تھی۔ پھر جب ان کی اپنی تدبیر سے نہیں بلکہ محض اتفاقاً ان کو حکومت حاصل ہو گئی تو پولوسی مسیحیت کے ناممکن العمل دائرہ میں زندگی بسر کرنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اس لیے انھوں نے مسیحیت کی ساری حدیں توڑ ڈالیں، اور ظلم و ستم اور قتل و غارتگری کی انتہا کر دی۔

## ظلم کا مقابلہ کرنے کی رُوح کا فقدان

ابتدا میں تو مسیحیوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ "ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی پیش کر دینا" اور "شریر کا مقابلہ کبھی نہ کرنا" مسیح کی دائمی تعلیم ہے۔ اس لیے جب ان کی تعداد خوب بڑھ گئی اور ان کے اثرات وسیع ہو گئے، اس وقت بھی ان میں ظلم کا مقابلہ کرنے اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کی رُوح پیدا نہ ہو سکی۔ سنہ ۶۴ عیسوی میں جبکہ یونان اور روم، شام اور فلسطین میں مسیحیوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو چکی تھی، نیرو نے ان پر حریقِ روم کا جھوٹا الزام لگایا اور اس کے حکم سے ہر وہ شخص جس نے مسیحی ہونے کا اقرار کیا، گرفتار کر لیا گیا۔ کسی کو صلیب پر چڑھایا گیا، کسی کو زندہ جلا دیا گیا، کسی کو کتوں سے پھڑوایا گیا اور سینکڑوں عیسائی عورتوں اور مردوں اور بچوں کو روم کے اکھاڑوں میں وحشیانہ کھیلوں کا تختۂ مشق بنایا جانے لگا۔ سنہ ۷۰ء میں تیتوس (TITUS) کے زیر قیادت بیت المقدس پر چڑھائی کی گئی۔ ۹۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنا لیے گئے۔ گیارہ ہزار آدمیوں کو بھوکا مار دیا گیا۔ ہزاروں آدمی پکڑ کر روم کے اکھاڑوں اور اسٹیٹ تھیٹروں میں جنگلی جانوروں کا لقمہ بننے یا سپاہیوں کی شمشیر زنی کا تختۂ مشق بننے کے لیے بھیج دیے گئے۔[1]

نیرو کے بعد مارکوس آریلیوس، سپٹیموس سیوروس، ڈیسیوس اور والیریان نے مسیحیت اور اس کے پیرووں کو کچلنے کی کوششیں کیں۔ آخر میں ڈایوکلیشیان نے تو ظلم و ستم کی حد کر دی۔ اس نے عام حکم جاری کر دیا کہ کلیسا مسمار کر دیے جائیں، انجیلیں جلا دی جائیں، اور کلیساؤں کے اوقاف ضبط کر لیے جائیں۔ سنہ ۳۰۳ء میں خود

---

[1] GIBBON VOL.II CHAP. 16

EARLY DAYS OF CHRISTIANITY PP. 488-89

شہنشاہ نے نیکومیڈیا کے مرکزی کلیسا کو پیوندِ خاک کر دیا اور مقدس کتابیں جلوا دیں۔ ۳۰۴ء میں اس نے عام حکم دے دیا کہ جو شخص مسیحی مذہب پر اصرار کرے وہ قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد سختیاں اور بڑھیں، یہاں تک کہ جو لوگ مسیحی مذہب چھوڑنے سے انکار کرتے ان کے بدن زخمی کر کے ان پر سرکہ اور نمک ڈالا جاتا اور بعد میں ان کی بوٹی بوٹی کاٹی جاتی تھی۔ بعض اوقات ان کو کنیسوں میں بند کر کے آگ لگا دی جاتی اور زیادہ لطف اٹھانے کے لیے ایک ایک عیسائی کو پکڑ کر دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جاتا تھا یا لوہے کے کانٹے اس کے بدن میں بھونکے جاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ تمام سلطنت میں عیسائی پھیلے ہوئے تھے، سلطنت کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے عہدے بکثرت ان کے ہاتھ میں تھے، اور خود شہنشاہ کے قصر میں عیسائیوں کی ایک کثیر جماعت موجود تھی۔ لیکن مسیحیوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ اس کثرت قوت کے زمانے میں بھی وہی شریر کا مقابلہ نہ کرنے اور ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی پیش کر دینے کی تعلیم ہی واجب العمل ہے جو اسرائیلیوں کو انتہائی کمزوری و بے بسی کی حالت میں دی گئی تھی۔ اس لیے شام، فلسطین، عراق، مصر، افریقہ، اسپین، گال، سسلی، اٹلی، اتیریا، ایشیائے کوچک، غرض کہیں بھی کسی عیسائی نے ان مظالم پر دم نہ مارا اور ساری قوم ان تجاوزات کو خودکشانہ بے عملی کے ساتھ برداشت کرتی رہی۔

## مسیحی خود ظالم بن گئے

یہ تو تھی مسیحیت کی تفریط۔ اس کے بعد جب قسطنطینِ اعظم نے اس کو قبول کر لیا اور وہ عملاً سلطنت کا مذہب بن گئی تو وہ تفریط کے انتہائی نقطہ سے جست لگا کر دفعۃً افراط کے انتہائی نقطہ پر جا پہنچی۔ پہلی خرابی تو اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ پولوسی مسیحیت کو سیاست و تمدن سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے پیروؤں نے اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے ایک خالص انفعالی زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ مگر جب اتفاقِ وقت سے ان پر سلطنت کی ذمہ داریاں آپڑیں تو دوسری اور پہلے سے زیادہ شدید خرابی پیدا ہو گئی اور وہ یہ تھی کہ جہانبانی و حکمرانی کے لیے چونکہ مسیحیت نے ان کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی، اس لیے یہ سارا کاروبار شریعتِ خدا کے بجائے شریعتِ نفس کے مطابق سر انجام دینا شروع کر دیا۔ معاملاتِ سلطنت میں تو جنگ بھی ہے اور صلح بھی، سیاست بھی ہے اور تعزیر بھی، انتقام بھی ہے اور عفو بھی۔ مگر موسوی شریعت سے جدا کی ہوئی مسیحیت کے پاس ان میں سے کسی کام کے لیے بھی کوئی ضابطہ و قانون اور دستورِ عمل موجود نہ تھا۔ اس نے زندگی کے

---

ل REV CUTTS CONSTANTINE THE GREAT P.P. 55-60

معاملات کے لیے بجز اس ایک قانون کے کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو اور کرتہ چھیننے والے کو چوغہ بھی اُتار دے اور کوئی قانون نہ بنایا تھا۔ مگر اس انفعال و تذلل کی تعلیم کے تنگ دائرے میں رہ کر مسیحیوں کے لیے ناممکن تھا کہ سلطنت کے اہم معاملات کو انجام دے سکتے۔ اس لیے وہ اس دائرے کو توڑ کر باہر نکلنے پر مجبور ہوئے اور جب وہ اسے توڑ کر باہر نکل آئے، تو اپنے نفس کے فتوے پر عمل کرنے کے لیے بالکل آزاد تھے۔ اس عملی دنیا میں ان کے لیے کوئی ایسی دینی ہدایت اور الٰہی روشنی موجود ہی نہ تھی جو انھیں صحیح راستہ دکھا سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے خدا کی زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کر دیا اور طغیان و سرکشی کا وہ ہنگامہ برپا کیا کہ آج تک سرد نہ ہو سکا۔

قسطنطین کے عہد میں تو سلطنت کے تقریباً نصف باشندے بُت پرست تھے اس لیے اس نے ان لوگوں پر زیادہ ظلم کرنے کی جرأت نہ کی۔ بس اتنے ہی پر اکتفا کیا کہ مندروں کے دروازے اور ان کی چھتیں منہدم کرا دیں۔ بتوں کے کپڑے اور زیور اتروا دیے اور ان کو معبدوں سے باہر نکلوا دیا؎ مگر چند سال بعد جب کلیسا کو ملک پر پورا تسلط حاصل ہو گیا تو مسیحیت کے مقتداؤں نے وثنیت کو کچلنے کا عزم کر لیا اور مذہبی قوانین کے حسب ذیل دو اصول مقرر کیے جن سے غیر مذاہب کو جبراً مٹانے کے بے شمار احکام مستنبط ہوتے تھے۔

۱۔ جن گناہوں سے مجسٹریٹ منع نہ کرے یا ان پر سزا نہ دے ان کی ذمہ داری میں وہ خود بھی ایک حد تک شریک ہوتا ہے۔



۲۔ مصنوعی دیوتاؤں اور حقیقی ارواح خبیثہ کی بُت پرستانہ عبادت خالقِ برتر کی بزرگی کے خلاف سخت قابل نفرت جرم ہے۔

## سینیٹ کی قرارداد اور تھیوڈوسیوس کے فرامین

ان اصولِ موضوعہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب سے پہلے رومن سینیٹ نے باضابطہ یہ قرارداد منظور کی کہ "رومیوں کا مذہب جوپیٹر ( JUPITER ) کی عبادت نہیں بلکہ مسیح کی عبادت ہے۔" اس کے بعد بتوں کی پرستش اور ان پر نذر و نیاز چڑھانا اور قربانیاں کرنا سب کچھ قانوناً منع قرار دے دیا گیا اور ان افعال کے مرتکبوں کے لیے شدید سزائیں مقرر کی گئیں۔ شاہ تھیوڈوسیوس نے اپنے فرامین میں ہر قسم کی غیر مسیحی عبادتوں کو خواہ وہ علانیہ کی جائیں یا گھروں میں چھپ کر، حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت اور جرم مستلزم سزائے موت قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مندروں کو توڑنے، ان کی جائیدادیں ضبط کرنے،

؎ REV CUTT. CONSTANTINE THE GREAT P. 218

اور عبادت کے سامانوں کو مٹا دینے کا بھی عام حکم دے دیا۔ اس حکم کے مطابق سب سے پہلے مرکزِ حکومت میں وثنیت کا جبراً خاتمہ کیا گیا۔ پھر صوبوں میں یہی مشق کرائی گئی۔ گال کے صوبہ میں تورس کے بشپ نے دیندار پادریوں کی ایک پوری فوج لے کر مندروں، معبدوں اور بتوں کو، حتیٰ کہ اُن درختوں کو بھی جو مقدس سمجھے جاتے تھے، پیوندِ خاک کر دیا۔ شام میں مسیحیت کے مقدس پیشوا مارسیلوس MARCELLUS نے جو حلقہ فامیا DIOCESS OF APAMEA کا بشپ تھا، جوپیٹر کے عظیم الشان مندر کو تباہ کر دیا اور ایک پوری فوج فراہم کی جسے ساتھ لے کر وہ اپنے حلقہ کے غیر مسیحی معابد کو روندتا پھرتا تھا۔ اسکندریہ میں مصر کے آرچ بشپ تھیوفیلس THEOPHILUS نے سراپیس کے مندر کو جو یونانی فنِ تعمیر کا بے نظیر نمونہ تھا، مسمار کر دیا۔ اس کے کتب خانہ کو جس میں خاندانِ بطالسہ نے علوم و فنون کا بہترین ذخیرہ جمع کیا تھا، نذرِ آتش کر دیا[1]۔ سیراپیس کے بُت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اس کے بازوؤں کو اسکندریہ کے بازاروں میں گھسٹوایا تاکہ اس کے معتقدین دیکھ کر جلیں اور آخر میں اس کے ٹکڑوں کو ہزارہا آدمیوں کے سامنے جلوا دیا۔ اسی طرح دوسرے صوبوں میں بھی "مذہبی دیوانوں کی ایک پوری فوج کسی باضابطہ اختیار اور کسی نظم و تربیت کے بغیر پُرامن باشندوں پر حملے کرتی اور قدیم فنِ تعمیر کے بہترین نمونوں کو برباد کرتی پھرتی تھی"[2]۔

ان مظالم کا نتیجہ یہ ہوا کہ بُت پرست رعایا نے تلوار کے خوف سے اس مذہب کو قبول کر لیا جس کو وہ دل سے پسند نہ کرتی تھی۔ بددِل اور بے اعتقاد پیروؤں سے مسیحی کلیسا بھر گئے۔ ۲۸ برس کے اندر روم کی عظیم الشان سلطنت سے وثنیت کا نام و نشان مٹ گیا اور یورپ، افریقہ اور شرقِ اردن میں تلوار کے زور سے مسیحیت پھیل گئی۔

## عیسائیوں کی آپس میں اخلاق سوز لڑائیاں

اس کے بعد سے مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے درمیان اور خود مسیحیوں میں باہم جس قدر لڑائیاں ہوئیں ان میں اخلاق و انسانیت کے مبادی و اصول کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کے ایسے ایسے وحشیانہ طریقے اختیار کیے گئے ہیں جن کے ہولناک ذکر سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ غیر مسیحی عقائد کو مٹانے کے لیے قوت

---

[1] اس کتب خانہ کو تنہا مارک انتونی نے دو لاکھ کتابیں دی تھیں اور دسیوس لکھتا ہے کہ ۲۰ برس بعد اس کتب خانہ کی خالی الماریوں کو دیکھ کر ہر وہ دل رنج و الم اور نفرت و غضب سے بھر جاتا تھا جو مذہبی تعصب سے بالکل سیاہ نہ ہو گیا ہو۔ یہی کتب خانہ ہے جس کے جلانے کا الزام بعض عیسائی مورخوں نے مسلمانوں پر لگایا ہے۔ (مؤلف)

[2] یہ تمام تفصیلات گبن کی تاریخ زوال و سقوطِ سلطنتِ روم کے باب ۲۸ سے لی گئی ہیں۔ (مؤلف)

کے استعمال کے جن طریقوں کو مسیحیت کے پیروؤں نے جائز کر رکھا تھا ان کا ایک نمونہ وہ مذہبی عدالتیں ہیں جو انکوزیشن INQUISITION کے نام سے خود پاپایانِ روم کے ماتحت قائم تھیں۔ ان میں کفر و الحاد، یہودیت، اسلام اور تعدّدِ ازدواج جیسے "جرائم" کی سزا دینے کے لیے جو قانونِ تعزیرات رائج تھا اس میں منجملہ بہت سی سزاؤں کے، انسانوں کو زندہ جلا دینا، زبان کاٹ ڈالنا اور مرے ہوئے شخص کی قبر کھود کر ہڈیاں نکال پھینکنا بھی شامل تھا۔ تنہا اسپین میں اس مذہبی عدالت کے حکم سے تین لاکھ چالیس ہزار آدمی مختلف طریقوں سے قتل کیے گئے ہیں جن میں ۳۲ ہزار وہ ہیں جنھیں زندہ جلایا گیا۔ اس کے علاوہ میکسیکو، قرطاجنہ، سسلی، سارڈینیا، مالٹا، نیپلز، میلان، فلانڈرس وغیرہ علاقوں کی مذہبی عدالتوں نے اپنی مدتِ حیات میں جتنے آدمیوں کو غیر مسیحی عقائد رکھنے کی پاداش میں ہلاک کرایا ان کی تعداد کا کم سے کم اندازہ ڈیڑھ لاکھ کیا گیا ہے۔[1]

یہ پولوسی مسیحیت کی ناقص تعلیم کا دوسرا نتیجہ ہے۔ پہلا نتیجہ تو یہ تھا کہ جب مسیحیوں نے اس مذہب کے احکام کی پابندی کی تو حد سے زیادہ نرم بن گئے، اور مقاومت کی استطاعت کے باوجود ظلم و ستم کو برداشت کر کے تین سو برس تک اپنے آپ کو تباہ کراتے رہے، اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ جب زمانہ نے ان کو قوت بخشی اور سلطنت کی ذمہ داریاں ان پر آپڑیں تو انھیں مسیحیت کے تنگ دائرے سے نکلنا پڑا اور یہاں مذہب کی ہدایت و رہنمائی نہ پا کر انھوں نے اپنے ابنائے نوع پر ہر قسم کے ظلم و ستم کرنے شروع کیے اور نفس کی پیروی میں آزادی کے ساتھ جو چاہا کیا۔[2]

## متذکرہ حالات کی ذمہ داری موجودہ مسیحیت پر ہے

پیروانِ مسیحیت نے جتنے اخلاقی گناہ کیے ہیں ان کی ذمہ داری میں خود مسیحیت بھی شامل ہے، کیونکہ اس نے انھیں سیدھی راہ نہیں بتائی۔ اسلام کی طرح مسیحیت اپنے پیروؤں کے گناہوں سے اس بنا پر تبرّی نہیں کر سکتی کہ انھوں نے اس کے بتائے ہوئے اصول و قواعد کی پیروی نہیں کی۔ وہ ان دو صورتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہے کہ یا تو اُن سب عیسائیوں کو گناہگار قرار دے جنھوں نے

---

[1] ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA "INQUISITION"

[2] تیسرا اور آخری نتیجہ یہ ہے کہ مذہب کے نام سے جبر و ظلم اور جاہلانہ تعصب کا طوفان جب حد سے گزر گیا تو انھیں خود مذہب سے نفرت ہو گئی اور وہ دنیا بھر میں لامذہبی پھیلانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ (مؤلف)

سیاست وحکمرانی کی ذمہ داری قبول کی ہے، خواہ حق کے ساتھ اسے انجام دیا ہو یا غیر حق کے ساتھ۔ یا پھر اسے ان تمام عیسائیوں کو بھی بے گناہ قرار دینا پڑے گا جنھوں نے جہانبانی وفرمانروائی کے بار کو اُٹھایا اور اس کے امور کو انجام دیا، خواہ حق کے ساتھ یا غیر حق کے ساتھ۔ وہ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت اختیار نہیں کر سکتی، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں غیر معقول ہیں۔ (۴۲)

## پاپائی نظام

عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیحؑ کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں، لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور انھیں یہ کہہ کر نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔

کوئی شخص جو مسیحی مذہب اور پاپائیت کی تاریخ سے واقف ہے، میرے اس اشارہ کو جو میں نے ان چند فقروں میں کیا ہے، سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ یورپ کا پاپائی نظام سینٹ پال کا پیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر مسیحیت کی بنیاد صرف اُن اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عہدنامہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تمدن اور ایک سیاست کا نظام چلایا جاسکے۔ مگر جب پاپاؤں نے یورپ میں بلا واسطہ یا بالواسطہ تھیاکریسی قائم کی تو اس کے لیے ایک قانونِ شریعت بھی وضع کیا جو ظاہر ہے کہ کسی وحی والہام سے ماخوذ نہ تھا، بلکہ خود ان کا گھڑا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے جو نظامِ عقائد، جو مذہبی اعمال و رسوم، جو نذریں اور نیازیں، جو معاشرتی ضوابط وغیرہ تجویز کیے تھے ان میں سے کسی کی سند بھی ان کے پاس کتاب اللہ سے نہ تھی۔ اسی طرح انھوں نے خدا اور بندے کے درمیان مذہبی منصب داروں کو جو ایک مستقل واسطہ قرار دے دیا تھا یہ بھی ان کا خود ساختہ تھا۔ نیز انھوں نے کلیسا کے کارپردازوں کے لیے جو حقوق اور اختیارات تجویز کیے تھے اور جو مذہبی ٹیکس لوگوں پر لگائے تھے ان کے لیے بھی کوئی ماخذ ان کی اپنی ہوائے نفس کے سوا نہ تھا۔ ایسے نظام کا نام چاہے انھوں نے تھیاکریسی رکھ دیا ہو، لیکن وہ فی الحقیقت تھیاکریسی نہیں تھا۔ (۴۳)

یورپ اُس تھیاکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے اور عملاً اپنی خدائی تمام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو الٰہی حکومت کہنے کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ (۴۴)

فصل ۲

# عیسائیوں کے بُنیادی عقائد میں فساد

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ
قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۔

(المائدہ : ۷۷)

ترجمہ :۔ "کہو اے اہلِ کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سَوَآءَ السَّبِیْل سے بھٹک گئے"۔

## تقلیدِ اغیار کا مرض

یہ اشارہ ہے اُن گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے خصوصاً فلاسفہ یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متأثر ہو کر عیسائی اُس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداءً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انھوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفوں سے متأثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دُور کا واسطہ بھی نہ رہا۔

اس باب میں خود ایک مسیحی عالمِ دینیات (ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابلِ ملاحظہ ہے۔

## اناجیل کی رُو سے حضرت عیسیٰؑ انسان تھے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں "یسوع مسیح" JESUS CHRIST کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے۔

"پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا

ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی رُوح سے فیض یاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو "مسیح" تسلیم کرنے کے بعد "الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی۔" متی (۱۶ - ۲۲) لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ "خدا اور ساری اُمت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا۔" (لوقا ۲۴، ۱۹)

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ "مرقس" کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لئے لفظ "خداوند" LORD کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسوع کے ابتلا کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کے شایانِ شان ہے، مگر مرقس کی "فدیہ" والی عبارت (مرقس : ۱۰، ۴۵) اور آخری فسح کے موقعہ پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے۔ حتیٰ کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ یسوع کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفارہ سے کوئی تعلق تھا۔"



آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے:

"یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا اناجیل کی متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ "مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا ۱۳، ۳۳) وہ اکثر اپنا ذکر "ابنِ آدم" کے نام سے کرتا ہے ....... یسوع کہیں اپنے آپ کو "ابن اللہ" نہیں کہتا۔ اس کے دوسرے ہم عصر جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً ان کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خدا کا ممسوح سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً "بیٹے" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے

"....... مزید براں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لیے بھی "باپ" کا لفظ اسی اطلاق شان میں استعمال کرتا ہے ....... اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا۔ البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعہ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے۔"

پھر یہی مصنف لکھتا ہے:

"عید پینتکُست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ "ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا" یسوع کو اُس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہمعصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے .......

انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا تھا اور سوتا تھا، وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا۔ اُس نے دُکھ اُٹھایا اور مرا۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے ....... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصور کے بالکل خلاف ہو گا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثناء تھا تو وہ صرف اُسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔

پھر مسیح کو قادرِ مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دُعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے ٹل نہیں سکتی" اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و

ترتیب اُس زمانہ سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جبکہ مسیحی کلیسا نے مسیحؑ کو اللہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیحؑ کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں کہ مسیحؑ اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔"

## حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ بنا دیا گیا

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے:

"وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ "ابن اللہ" کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا...... یہ "ابن اللہ" کا لفظ یقینی طور پر ذاتی ابنیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جیسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو "خدا کا اپنا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال جس نے مسیح کے لفظ "خداوند" کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا۔ پھر اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ "خداوند یسوع مسیح" کی طرف بہت سے وہ تصورات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیے جو قدیم کُتب مُقدسہ میں خداوند یہوؔہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مسیحؑ کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیحؑ کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔"

## عقیدۂ تثلیث یونانی فکر پر مبنی ہے

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون مسیحیت CHRISTIANITY میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے، مذہبی خیالات بائیبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔

باپ، بیٹا اور رُوح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم (باپ، بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدے میں درج ہے جو نیقیاکی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا، اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے"۔

## اُلُوہیت مسیح کو باقاعدہ مسیحی عقیدہ قرار دیا گیا

اسی سلسلے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون تاریخ کلیسا CHURCH HISTORY کی یہ عبارت بھی قابلِ ملاحظہ ہے

"تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی اُلوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیاکی کونسل نے اُلوہیتِ مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا لیکن آخری فتح نیقیا ہی کے فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ رُوح کی اُلوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیا میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک قرار پا گیا۔

## شخصیت مسیحؑ میں الوہیت اور انسانیت کا اجتماع

"پھر اس دعوے پر کہ "بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسم ہوئی تھی" ——— ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیحؑ کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیحؑ کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی۔ اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں یعنی مسیحؑ بیک وقت دو مختلف مشیتوں کا حامل ہے۔"

## گناہ سے نجات اور فضلِ خداوندی

"اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلہ پر بھی خاص توجہ کی اور یہ سوال مدتوں زیرِ بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا؟ آخر کار ۵۲۹ء میں اورینج کی دوسری کونسل میں ......... یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا۔ جب تک وہ اُس فضلِ خداوندی سے، جو اصطباغ میں عطا کیا گیا ہے، نئی زندگی حاصل نہ کر لے۔ اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اُس کا مددگار نہ رہے اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل رہ سکتی ہے۔"

## انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کا عقیدہ

کتبِ آسمانی نے کبھی انسان کے پیدائشی گناہگار ہونے کا وہ تصور پیش نہیں کیا جسے ڈیڑھ ہزار سال سے عیسائیت نے اپنا بنیادی عقیدہ قرار دے رکھا ہے۔ آج خود کیتھولک علماء یہ کہنے لگے ہیں کہ بائبل میں اس عقیدے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ چنانچہ بائبل کا ایک مشہور جرمن عالم ریورینڈ ہربرٹ ہاگ HAAG اپنی تازہ کتاب IS ORIGINAL SIN IN SCRIPTURE میں لکھتا ہے کہ ابتدائی دور

کے عیسائیوں میں کم از کم تیسری صدی تک یہ عقیدہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ انسان پیدائشی گناہگار ہے۔ اور جب یہ خیال لوگوں میں پھیلنے لگا تو دو صدیوں تک عیسائی اہلِ علم اس کی تردید کرتے رہے۔ مگر آخر کار پانچویں صدی میں سینٹ آرگسٹائن نے اپنی منطق کے زور سے اس بات کو مسیحیت کے بنیادی عقائد میں شامل کر دیا کہ "نوعِ انسانی نے آدم کے گناہ کا وبال وراثت میں پایا ہے اور مسیحؑ کے کفارے کی بدولت نجات پانے کے سوا انسان کے لیے کوئی راہ نجات نہیں ہے۔" (۳۵)

## اصل بیماری غلو تھی

مسیحی علماء کے ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداءً جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا وہ عقیدت اور محبت کا غلو تھا۔ اسی غلو کی بنا پر مسیح علیہ السلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں، اور کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا، حالانکہ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفہ کی ہوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے بچنے کی سعی کرتے، انھوں نے اپنے گذشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو نباہنے کے لیے ان کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیحؑ کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کیے بغیر محض منطق اور فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔ یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے ان آیات میں مسیحیوں کو متنبہ فرمایا ہے۔ (۳۶)

## حضرتِ مریم کو مادرِ خدا قرار دینا

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝

(المائدہ۔ آیت ۱۱۶۔۱۱۷)

ترجمہ:۔ "غرض جب (یہ احسانات یاد دلا کر) اللہ فرمائے گا کہ "اے عیسیٰ ابن مریم، کیا تُو نے

لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنا لو؟" تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ "سبحان اللہ" میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا۔ آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے اُن سے اُس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ میں اُسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں انکے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بُلا لیا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں"۔

عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیحؑ اور رُوح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسیحؑ کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی اُلوہیت یا قدوسیت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیحؑ کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دُنیا اس تخیل سے بالکل ناآشنا تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے آخری دَور میں اسکندریہ کے بعض علماءِ دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریم کے لیے "اُمُّ اللہ" یا "مادرِ خُدا" کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُلوہیتِ مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ لیکن اوّل اوّل چرچ اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نسطوریس کے اس عقیدے پر کہ مسیحؑ کی واحد ذات میں دو مستقل جُداگانہ شخصیتیں جمع تھیں، مسیحی دنیا میں بحث وجدال کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ۴۳۱ء میں شہر افسوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریم کے لیے "مادرِ خدا" کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا، حتیٰ کہ نزولِ قرآن کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریم اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ، بیٹا اور رُوح القدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہو گئے۔ ان کے مجسمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے، ان کے آگے عبادت کے جملہ مراسم ادا کیے جاتے تھے، انہی سے دعائیں مانگی جاتی تھیں، وہی فریاد رس، حاجت روا، مشکل کُشا اور بے کسوں کی پُشتیبان تھیں، اور ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ "مادرِ خدا" کی حمایت و سرپرستی اسے حاصل ہو۔ قیصر جسٹینین اپنے ایک قانون

کی تمہید میں حضرت مریم کو اپنی سلطنت کا حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل نرسیس میدانِ جنگ میں حضرت مریم سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر قیصر ہرقل نے اپنے جھنڈے پر "مادرِ خدا" کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریکِ اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدت سے آواز اُٹھائی، لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔ (۴۷)

فصل ۳

# صحفِ اناجیل کی تاریخی حیثیت

انجیل دراصل نام ہے ان الہامی خطبات اور اقوال کا، جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں، بحیثیت نبی ارشاد فرمائے۔ وہ کلماتِ طیبات آپ کی زندگی میں لکھے اور مرتب کیے گئے تھے یا نہیں، اس کے متعلق اب ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں نے انھیں نوٹ کرلیا ہو، اور ممکن ہے کہ سننے والے معتقدین نے ان کو زبانی یاد کر رکھا ہو۔ بہرحال ایک مدت کے بعد جب آنجناب کی سیرتِ پاک پر مختلف رسالے لکھے گئے، تو ان میں تاریخی بیان کے ساتھ ساتھ وہ خطبات اور ارشادات بھی جگہ جگہ حسبِ موقع درج کردیے گئے جو ان رسالوں کے مصنفین تک زبانی روایات اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے پہنچے تھے۔ آج متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی جن کتابوں کو اناجیل کہا جاتا ہے دراصل انجیل وہ نہیں ہیں، بلکہ انجیل حضرت مسیحؑ کے وہ ارشادات ہیں جو ان کے اندر درج ہیں۔ ہمارے پاس ان کو پہچاننے اور مصنفینِ سیرت کے اپنے کلام سے ان کو ممیز کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جہاں سیرت کا مصنف کہتا ہے کہ مسیح نے یہ فرمایا یا لوگوں کو یہ تعلیم دی، صرف وہی مقامات اصل انجیل کے اجزاء ہیں۔

قرآن انھی اجزا کے مجموعے کو انجیل کہتا ہے اور انھی کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزا کو مرتب کرکے قرآن سے ان کا مقابلہ کرکے دیکھے تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا۔ اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہوگا، وہ بھی غیر متعصبانہ غور و تامل کے بعد بآسانی حل کیا جاسکے گا۔ (۳۸)

## کیا موجودہ اناجیل قابلِ اعتماد ہیں؟

یہودی مذہب کی طرح مسیحیت[ا] کے متعلق بھی ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ایک ہی کتاب ہے

---

ا مسیحی مذہب سے مراد فی الحقیقت وہ مذہب نہیں ہے جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے (باقی )

جس کو تمام مسیحی دنیا اپنے مذہب کی بنیادی کتاب تسلیم کرتی ہے۔ اور وہ انجیل ہے۔ انجیل کے متعلق یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ آج وہ جس صورت میں موجود ہے اس سے صرف موجودہ مسیحیت کے معتقدات ہی ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں، ورنہ یہ سوال کہ فی الاصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کیا تھی، اس سے حل نہیں ہوتا۔ پہلے ذرا انجیلی صحائف کی تاریخی حیثیت پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

آج ہم جس مجموعہ کو انجیل کہتے ہیں وہ دراصل چار بڑے صحیفوں پر مشتمل ہے، متی، مرقس، لوقا، یوحنا لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ بھی حضرت عیسیٰؑ کا نہیں ہے۔ جس طرح قرآن مجید میں وہ تمام منزل من اللہ آیات اور سورتیں جمع ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں، اس طرح کسی کتاب میں وہ وحیاں ہم کو یکجا نہیں ملتیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ پھر وہ مواعظ و نصائح بھی ہم کو خود عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے الفاظ میں نہیں ملتے جو اُنھوں نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے زمانے میں مختلف مواقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ یہ صحیفے جو ہم تک پہنچے ہیں، نہ خدا کا کلام ہیں، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا، بلکہ دراصل یہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے بھی شاگردوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ جن میں ان لوگوں نے اپنے علم و فہم کے مطابق حضرتؑ کے حالات اور ان کی تعلیمات کو جمع کیا ہے۔



## صحفِ انجیل اور ان کے مرتبین

لیکن یہ کتابیں خود اس قدر مجہول الاصل ہیں کہ ان پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی کتاب مسیحؑ کے حواری متی کی طرف منسوب ہے۔ اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ متی کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ متی کی اصل کتاب جس کا نام لوجیا LOGIA تھا مفقود ہے۔ جو کتاب متی کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس کا مصنف کوئی گمنام شخص ہے، جس نے دوسری کتابوں کے ساتھ لوجیا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ خود

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دی تھی بلکہ وہ مذہب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس اس بات کے لیے قوی دلائل ہیں کہ اس مسیحیت کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ نے نہیں دی تھی بلکہ وہ تو وہی اسلام لے کر آئے تھے جو ان سے پہلے سارے پیغمبر لائے تھے اور ان کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے۔ آگے چل کر ہم ان دلائل میں سے بعض کو بیان کریں گے۔ یہاں ہم صرف اس بات پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم مسیحیت پر یہاں جو بحث کر رہے ہیں وہ دراصل دینِ مسیحؑ سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس دین سے متعلق ہے جو مسیح علیہ السلام کے نام پر بنایا گیا ہے۔ (مؤلف)

متی کا ذکر اس میں اس طرح کیا گیا ہے جیسے کسی غیر آدمی کا کیا جاتا ہے[1]۔ پھر اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کی ۱۰۶۸ آیات میں سے ۴۷۰ بعینہٖ وہی ہیں جو مرقس کی انجیل میں آئی ہیں۔ حالانکہ اگر اس کا مصنف متی حواری ہوتا تو اس کو ایک ایسے شخص کی کتاب سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہ تھی جو نہ حواری تھا اور نہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی ملا تھا۔ مسیحی علماء کا خیال ہے کہ یہ کتاب ۴۰ء میں یعنی مسیحؑ سے ۴۱ برس بعد لکھی گئی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ ۹۰ء کی تصنیف ہے۔

دوسری کتاب مرقس کی طرف منسوب ہے اور عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرقس خود ہی اس کا مصنف ہے، لیکن یہ بات ثابت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی نہیں ملا اور نہ ان کا مرید ہوا[2]۔ وہ دراصل پطرس PETERS حواری کا مرید تھا اور جو کچھ اُن سے سنتا تھا اسے یونانی زبان میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے عیسائی مصنفین اس کو عموماً "پطرس کا ترجمان" کہا کرتے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ۶۳ء اور ۷۰ء کے درمیان کسی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

تیسری کتاب لوقا کی طرف منسوب ہے اور یہ بالکل مسلّم ہے کہ لوقا نے کبھی مسیحؑ کو نہیں دیکھا اور نہ اس سے استفادہ کیا۔ وہ پولوس ST. PAUL کا مرید تھا، ہمیشہ اس کی صحبت میں رہا اور اس نے اپنی انجیل میں اسی کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ خود پولوس اس کی انجیل کو اپنی انجیل کہتا ہے۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ سینٹ پال خود بھی مسیحؑ کی صحبت سے محروم تھا، اور مسیحی روایات کے مطابق واقعہ صلیب کے چھ برس بعد وہ اس مذہب میں داخل ہوا اس لیے لوقا اور مسیح کے درمیان سلسلۂ روایت کی ایک کڑی بالکل غائب ہے۔ انجیل لوقا کی تاریخ بھی متعین نہیں ہے۔ بعض اس کو ۵۸ء کی تصنیف بتاتے ہیں اور بعض ۷۴ء کی۔ مگر ہارنک، میگفرٹ اور پلومر جیسے محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ ۶۰ء سے پہلے لکھی گئی۔

چوتھی کتاب یوحنا کی انجیل کہلاتی ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق یہ مشہور یوحنا حواری کی لکھی ہوئی نہیں

---

[1] متی باب ۹، آیت ۹ میں لکھا ہے:
"یسوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نام ایک شخص کو محصول کی چوکی پر دیکھا"
ظاہر ہے کہ مصنف خود اپنا تذکرہ اس طرح نہیں کر سکتا"۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دیے جانے کے وقت وہ تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا۔ مگر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (مؤلف)

ہے بلکہ کسی اور مجہول الاحوال شخص کی ہے جس کا نام یوحنا تھا۔ یہ کتاب مسیحؑ سے بہت بعد ۹۰ء میں یا اس کے بھی بعد لکھی گئی ہے۔ ہارنک اس مدت کو ۱۱۰ء تک بڑھا دیتا ہے۔

## اناجیل کی دستاویزی حیثیت کا جائزہ

ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی مسیحؑ تک نہیں پہنچتا۔ اور ان کی سند پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسیحؑ نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا۔[1] لیکن زیادہ عمیق تحقیقات سے ان کتابوں کی دستاویزی حیثیت اور بھی زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے۔

اولاً چاروں انجیلوں کے بیانات میں اختلاف ہے، حتیٰ کہ پہاڑی کے وعظ کو بھی جو مسیحی تعلیم کا اصل الاصول ہے متی، مرقس اور لوقا تینوں نے مختلف اور متضاد طریقوں سے بیان کیا ہے۔

ثانیاً چاروں انجیلوں میں ان کے مصنفین کے خیالات و تاثرات صاف طور پر نمایاں ہیں۔ متی کے مخاطب یہودی معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان پر اتمام حجت کرتا نظر آتا ہے۔ مرقس کے مخاطب رومی ہیں اور وہ ان کو اسرائیلیات سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔ لوقا سینٹ پال کا وکیل ہے اور دوسرے حواریوں کے خلاف اس کے دعاوی کی تائید کرنا چاہتا ہے۔ یوحنا ان فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات سے متاثر نظر آتا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں مسیحیوں کے درمیان پھیل گئے تھے۔ اس طرح ان چاروں انجیلوں کے درمیان معنوی اختلاف، لفظی اختلاف سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ثالثاً اناجیل سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں، حالانکہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے تمام حواریوں کی زبان سُریانی تھی۔ زبان کے اختلاف سے خیالات کی تعبیر میں اختلاف ہو جانا قدرتی بات ہے۔

رابعاً، اناجیل کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش دوسری صدی عیسوی سے پہلے نہیں کی گئی۔ ۱۵۰ء تک عام خیال یہ تھا کہ زبانی روایت تحریر سے زیادہ مفید ہے۔ دوسری صدی کے آخر میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا لیکن اس زمانہ کی تحریروں کو مستند نہیں سمجھا جاتا۔ "عہد نامہ جدید" NEW TESTAMENT کا پہلا مستند متن قرطاجنہ کی کونسل میں منظور کیا گیا جو ۳۹۷ء میں منعقد ہوئی تھی۔

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ یہ کتابیں وثوق و استناد کے اعتبار سے قرآن تو درکنار حدیث کے کسی ضعیف ترین مجموعہ کے برابر بھی نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کا وہ مرتبہ ہے جو ہمارے ہاں مولود شریف کی کتابوں کا ہے۔ (مؤلف)

خامساً، اناجیل کا قدیم ترین نسخہ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے چوتھی صدی عیسوی کے وسط کا ہے، دوسرا نسخہ پانچویں صدی کا اور تیسرا ناقص نسخہ بھی جو پاپائے رُوم کے کتب خانہ میں ہے چوتھی صدی سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ پس یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلی تین صدیوں میں جو انجیلیں رائج تھیں ان سے موجودہ اناجیل کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں۔

سادساً، اناجیل کو قرآن کی طرح حفظ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کی اشاعت کا انحصار ابتداءً روایت بالمعنی پر رہا جس میں حافظہ کے اختلال اور راویوں کے ذاتی خیالات کا اثر آنا قدرتی امر ہے۔ بعد میں جب کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ نقل نویسوں کے رحم پر تھیں۔ نقل کرتے وقت ہر شخص کے لیے آسان تھا کہ جس چیز کو اپنے عقائد کے خلاف دیکھے حذف کر دے اور جس کی کمی پائے بڑھا دے۔ لے

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اناجیل اربعہ میں ہم کو مسیح کی اصل تعلیم ملتی ہے۔ پس آئندہ صفحات میں مسیحیت کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا وہ اس دین کے متعلق نہ ہوگا جس کی تعلیم مسیح علیہ السلام نے دی تھی بلکہ اس مسیحیت کے متعلق ہوگا جس پر آج کل مسیحی دنیا اعتقاد رکھتی ہے۔ (۲۹)

## قرآن کس انجیل کی تصدیق کرتا ہے

"نئے عہد نامے" NEW TESTAMENT کی کتاب اعمال ACTS تو در کنار، چاروں انجیلیں GOSPELS بھی الہامی کتابیں نہیں ہیں، نہ قرآن ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ البتہ قرآن اس انجیل کی تصدیق کرتا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اب آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ وہ انجیل کہاں ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس انجیل کے منتشر اجزا او زبانی روایات کے ذریعہ سے نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں کے مصنفین کو پہنچے تھے اور انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں مختلف مقامات پر انھیں درج کیا ہے۔ ان کتابوں میں حضرت عیسیٰ کی جو تقریریں اور امثال ملتی ہیں وہ اسی انجیل کے متفرق اجزا ہیں اور ان میں آپ مشکل ہی سے کوئی بات ایسی پائیں گے

---

لے یہ پوری بحث ذیل کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ مؤلف

DUMELLOW, COMMENTARY ON THE HOLY BIBLE Y.K.

HISTORY OF CHRISTIANITY

جسے قرآن کے خلاف کہا جا سکے۔ (۴۰)

## انجیل اور دیگر کتب آسمانی کے متعلق ایک جامع جائزہ

قرآن مجید جن کتابوں کی تصدیق کرتا ہے وہ "پرانا عہد نامہ" اور "نیا عہد نامہ" نہیں ہیں بلکہ تورات، زبور اور انجیل ہیں۔ تورات کو یہودیوں نے ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے نہیں رکھا بلکہ اس کے مختلف اجزاء پرانے عہد نامہ کی پہلی پانچ کتابوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اندر شامل INCORPORATE کر دیے۔ آپ ان کتابوں میں سے اس تورات کے اجزا کو اس علامت کی مدد سے چھانٹ سکتے ہیں کہ جہاں جہاں کوئی عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے کہ خداوند نے موسیٰؑ سے یہ کہا، یا خدا نے یہ حکم دیا، یا موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے یہ تقریر کی، وہاں غالباً اس تورات کا کوئی جز نقل کیا گیا ہے۔ یہی صورت زبور کی بھی ہے کہ پرانے عہد نامے کی پوری کتاب "زبور" PSALMS نہیں بلکہ صرف زبور داؤد PALSMS OF DAVID کی قرآن نے تصدیق کی ہے، اور اس کے اجزاء کتاب زبور میں شامل پائے جاتے ہیں۔ موجودہ بائبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبور داؤد نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ہیں ان کے اندر فی الواقع کلام حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح بائبل میں امثال سلیمان کے نام سے جو کتاب موجود ہے اس میں بھی اچھی خاصی آمیزش پائی جاتی ہے اور اس کے آخری دو باب تو صریحاً الحاقی ہیں، مگر اس کے باوجود ان امثال کا بڑا حصہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ایوب علیہ السلام کے نام سے بھی بائبل میں درج ہے۔ لیکن حکمت کے بہت سے جوہر اپنے اندر رکھنے کے باوجود اسے پڑھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ واقعی حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب کی ابتداء میں حضرت ایوبؑ کے جس صبر عظیم کی تعریف کی گئی ہے اس کے بالکل برعکس وہ ساری کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ایوبؑ اپنی مصیبت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے خلاف سراپا شکایت بنے ہوئے تھے، حتیٰ کہ ان کے ہمنشین انھیں اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خدا ظالم نہیں ہے، مگر وہ کسی طرح مان کر نہ دیتے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ بائبل میں انبیاء بنی اسرائیل کے، اصحائف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً یسعیاہ ، یرمیاہ ، حزقی ایل ، عاموس اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو بکثرت مقامات ایسے آتے ہیں جنھیں پڑھ کر آدمی کی روح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں الہامی کلام کی شان صریح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اخلاقی تعلیم، ان کا شرک کے خلاف جہاد، ان کا توحید کے حق میں پُرزور استدلال اور ان کی بنی اسرائیل کے اخلاقی زوال پر سخت تنقیدیں پڑھتے وقت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اناجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تقریریں اور قرآن مجید اور یہ صحیفے ایک ہی سرچشمے سے نکلی ہوئی سوتیں ہیں۔ (۴۱)

ایسا ہی معاملہ انجیل کا بھی ہے کہ اس کو پیروانِ مسیح علیہ السلام نے ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے محفوظ نہ رکھا بلکہ مسیح علیہ السلام کے سوانح نگاروں (متی ، مرقس ، لوقا ، یوحنا وغیرہم) نے اپنی اپنی کتابوں میں اس کے وہ حصے درج کر دیے ہیں جو ان کو زبانی روایات کے ذریعے سے پہنچے تھے اور انھیں اس علامت کی مدد سے چھانٹا جا سکتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے یوں کہا ، یا مسیح علیہ السلام نے یہ تمثیل دی ، یا لوگوں کو خطاب کرکے یہ وعظ کیا۔ آپ میری اس نشان دہی پر پُرانے اور نئے عہد نامے میں تورات ، زبور اور انجیل کے ان اجزاء کو چھانٹ لیں اور پھر قرآن کا ان سے مقابلہ کرکے دیکھیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں بہت کم اختلاف پایا جاتا ہے ، اور جو تھوڑا سا اختلاف ہے اس کی بھی یہ معقول توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ قرآن اپنے اصل الفاظ میں ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے موجود ہے ، اور وہ تینوں کتابیں نہ اصل الفاظ میں محفوظ رکھی گئی ہیں اور نہ انھیں ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا ہے۔ ؎ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ تینوں کتابیں مستقل کتابوں کی حیثیت سے موجود تھیں یا نہیں ، لیکن کم از کم تورات کے متعلق یہ بات خود پُرانے عہد نامے کے بیانات سے بھی اور ہمارے ہاں کی احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہودیوں کے ہاں یہ ایک مدت

---

؎ اگر اس امر میں کسی کو شک ہو کہ یہ کتابیں اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہیں یا نہیں ، تو وہ مثال کے طور پر صرف پہاڑی کے وعظ کی عبارات متی اور لوقا کی انجیلوں میں نکال کر دیکھ لے۔ دونوں روایتوں میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس کی موجودگی میں مشکل ہی سے وحی کے اصل الفاظ محفوظ ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ (مؤلف)

(حاشیہ نمبر ۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

تک ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے پائی جاتی تھی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کا ایک نسخہ مدینے کے یہودیوں کے پاس موجود تھا۔ (۴۲)



؎ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: ۲ سلاطین باب ۲۲-۲۳۔ (مؤلف)

# باب ۴



# رہبانیت کا ظہور اور نشو و ارتقاء

# فصل ۱

# ظہورِ رہبانیّت کے اسباب[1]

## رہبانیت کے ابتدائی جراثیم

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا رہبانیتؒ سے نا آشنا تھا، مگر ابتدا ہی سے مسیحیت میں اس کے جراثیم پائے جاتے تھے اور وہ تخیلات اس کے اندر موجود تھے جو اس چیز کو جنم دیتے ہیں۔ ترک و تجرید کو اخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی رہبانیت کی بنیاد ہے اور یہ دونوں چیزیں مسیحیت میں ابتدا سے موجود تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ تجرّد کو تقدس کا ہم معنی سمجھنے کی وجہ سے کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی کہ وہ شادی کریں، بال بچوں والے ہوں اور خاندان کے بکھیڑوں میں پڑیں۔ اسی چیز نے تیسری صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک فتنے کی شکل اختیار کر لی۔ اور رہبانیت ایک وبا کی طرح مسیحیت میں پھیلنی شروع ہوئی۔

تاریخی طور پر اس کے تین بڑے اسباب تھے:

## پہلا سبب

ایک یہ کہ قدیم مشرک سوسائٹی میں شہوانیت، بدکرداری اور دُنیا پرستی جس شدّت کے ساتھ پھیلی ہوئی

---

[1] اس کا تلفظ رَہبانیت بھی کیا جاتا ہے اور رُہبانیّت بھی۔ اس کا مادہ رَہب ہے جس کے معنی خوف کے ہیں۔ رَہبانیّت کا مطلب ہے مسلکِ خوف زدگی اور رُہبانیّت کے معنی ہیں مسلکِ خوف زدگان۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہے کسی شخص کا خوف کی بنا پر (قطع نظر اس سے کہ وہ کسی کے ظلم کا خوف ہو، یا دُنیا کے فتنوں کا خوف یا اپنے نفس کی کمزوریوں کا خوف) تارک الدُنیا بن جانا اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا یا گوشہ ہائے عزلت میں جا بیٹھنا۔ (از مؤلف)

تھی اس کا توڑ کرنے کے لیے عیسائی علماء نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے عفت پر اتنا زور دیا کہ عورت اور مرد کا تعلق بجائے خود نجس قرار پا گیا، خواہ نکاح ہی کی صورت میں ہو۔ انھوں نے دُنیا پرستی کے خلاف اتنی شدت برتی کہ آخر کار ایک دین دار آدمی کے لیے سرے سے کسی قسم کی املاک رکھنا ہی گناہ بن گیا، اور اخلاق کا معیار یہ ہو گیا کہ آدمی بالکل مفلس اور ہر لحاظ سے تارک الدنیا ہو۔ اسی طرح مشرک سوسائٹی کی لذت پرستی کے جواب میں وہ اس انتہا پر جا پہنچے کہ ترکِ لذات، نفس کو مارنا اور خواہشات کا قلع قمع کر دینا اخلاق کا مقصود بن گیا، اور طرح طرح کی ریاضتوں سے جسم کو اذیتیں دینا آدمی کی روحانیت کا کمال اور اس کا ثبوت سمجھا جانے لگا۔

## دوسرا سبب

دوسرے یہ کہ مسیحیت جب کامیابی کے دَور میں داخل ہو کر عوام میں پھیلنی شروع ہوئی تو اپنے مذہب کی توسیع واشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اُس بُرائی کو اپنے دائرے میں دخل کرتا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔ اولیاء پرستی نے قدیم معبودوں کی جگہ لے لی۔ ہورس HORUS اور آئسس ISIS کے مجسموں کی جگہ مسیحؑ اور مریمؑ کے بُت پوجے جانے لگے۔ سیٹر نیلیا SATUR NALIA کی جگہ کرسمس کا تہوار منایا جانے لگا۔ قدیم زمانے کے تعویذ گنڈے، عملیات، فال گیری وغیب گوئی، جن بھوت بھگانے کا عمل، سب عیسائی درویشوں نے شروع کر دیے۔ اسی طرح چونکہ عوام اُس شخص کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے جو گندہ اور ننگا ہو اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہے، اس لیے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصور مقبول ہو گیا، اور ایسے ہی لوگوں کی کرامتوں کے قصوں سے عیسائیوں کے ہاں تذکرۃ الاولیاء قسم کی کتابیں لبریز ہو گئیں۔



## تیسرا سبب

تیسرے یہ کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لیے کوئی مفصل شریعت اور کوئی واضح سنت موجود نہ تھی۔ شریعت موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے، اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لیے مسیحی علماء کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے متاثر ہو کر اور کچھ خود اپنے رجحانات کی بنا پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے گئے۔ رہبانیت بھی انہی بدعتوں میں سے ایک تھی۔

فصل ۲

# مسیحی فلسفۂ رہبانیّت

## اِس فلسفہ کے ماخذ

مسیحی مذہب کے علماء اور ائمہ نے اُس کا فلسفہ اور اُس کا طریق کار بُدھ مذہب کے بھکشُوؤں سے، ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے، قدیم مصری فقراء ANCHORITES سے، ایران کے مانویوں سے، اور افلاطون اور فلاطینوس کے پیرو اشراقیوں سے اخذ کیا اور اسی کو تزکیۂ نفس، روحانی ترقی کا ذریعہ اور تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دے لیا۔ اس غلطی کے مرتکب کوئی معمولی درجہ کے لوگ نہ تھے۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی (یعنی نزول قرآن کے زمانے) تک جو لوگ مشرق اور مغرب میں مسیحیت کے اکابر علماء، بزرگ ترین پیشوا اور امام مانے جاتے ہیں، سینٹ اتھاناسیوس، سینٹ باسل، سینٹ گریگوری، نازیانزین، سینٹ کرائی سوسٹم، سینٹ ایمبرُوز، سینٹ جیروم، سینٹ آگسٹائن، سینٹ بینیڈکٹ، گریگوری اعظم، سب کے سب خود راہب اور رہبانیت کے زبردست علمبردار تھے۔ انہی کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔

## اِس فلسفہ کا عملی ظہور

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر سے ہُوا۔ اس کا بانی سینٹ اینتھونی ST. ANTHONY تھا جو ۲۵۰ئہ میں پیدا ہُوا اور ۳۵۰ئہ میں دُنیا سے رخصت ہُوا۔ اسے پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے فیوم کے علاقے میں پسپیر کے مقام پر (جو اب دیر المیمون کے نام سے معروف ہے) پہلی خانقاہ قائم کی۔ اس کے بعد دوسری خانقاہ اس نے بحر احمر کے ساحل پر قائم کی جسے اب دیر مار انطونیوس کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اُسی کی تحریروں اور ہدایات سے ماخوذ ہیں۔

اس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لیے خانقاہیں قائم ہوگئیں، جن میں سے بعض میں تین تین ہزار راہب بیک وقت رہتے تھے۔ ۳۲۵ئہ میں مصر

ہی کے اندر ایک اور مسیحی ولی پاخومیوس نمودار ہوا جس نے دس بڑی خانقاہیں راہبین اور راہبات کے لیے بنائیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقہ و یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیلتا چلا گیا۔ کلیسائی نظام کو اوّل اوّل اس رہبانیت کے معاملہ میں سخت اُلجھن سے سابقہ پیش آیا، کیونکہ وہ ترکِ دُنیا اور تجرّد اور غریبی و مفلسی کو روحانی زندگی کا آئیڈیل تو سمجھتا تھا، مگر راہبوں کی طرح شادی بیاہ اور اولاد پیدا کرنے اور ملکیت رکھنے کو گناہ بھی نہ ٹھہرا سکتا تھا۔ بالآخر سینٹ اتھاناسیُوس (متوفی ۳۷۳ء) سینٹ باسِل (متوفی ۳۷۹ء) سینٹ آگسٹائن (متوفی ۴۳۰ء) اور گریگوری اعظم (متوفی ۶۰۴ء) جیسے لوگوں کے اثر سے رہبانیت کے بہت سے قواعد چرچ کے نظام میں باقاعدہ داخل ہو گئے۔

فصل ۳

# عیسائی رہبانیت کی چند خصوصیات

اس راہبانہ بدعت کی چند خصوصیات ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

## ۱۔ جسمانی اذیت پسندی

سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو اذیتیں دینا۔ اس معاملہ میں ہر راہب دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ عیسائی اولیاء کے تذکروں میں ان لوگوں کے جو کمالات بیان کیے گئے ہیں وہ کچھ اس قسم کے ہیں:

اسکندریہ کا سینٹ مکاریوس اپنے جسم پر ہر وقت ۸۰ پونڈ کا بوجھ اُٹھائے رکھتا تھا۔ ۶ مہینے تک وہ ایک دلدل میں سوتا رہا اور زہریلی مکھیاں اس کے برہنہ جسم کو کاٹتی رہیں۔ اس کے مرید سینٹ یوسیبیوس نے پیر سے بھی بڑھ کر ریاضت کی۔ وہ ۱۵۰ پونڈ کا بوجھ اُٹھائے پھرتا تھا اور ۳ سال تک ایک خشک کنوئیں میں پڑا رہا۔ سینٹ سابیوس صرف وہ مکئی کھاتا تھا جو مہینہ بھر پانی میں بھیگ کر بدبودار ہو جاتی تھی۔ سینٹ بیساریون ۴۰ دن تک خاردار جھاڑیوں میں پڑا رہا اور ۴۰ برس تک اس نے زمین کو پیٹھ نہیں لگائی۔ سینٹ پاخومیوس نے ۱۵ سال، اور ایک روایت کے مطابق پچاس سال زمین کو پیٹھ لگائے بغیر گزار دیے۔ ایک ولی سینٹ جان تین سال تک عبادت میں کھڑا رہا۔ اس پوری مدت میں وہ نہ کبھی بیٹھا نہ لیٹا۔ آرام کے لیے بس ایک چٹان کا سہارا لے لیتا تھا اور اس کی غذا صرف وہ تبرک تھا جو ہر اتوار کو اس کے لیے لایا جاتا تھا۔ سینٹ سیمیون اسٹائلائٹ (۳۹۰ء تا ۴۴۹ء) جو عیسائیوں کے اولیائے کبار میں شمار ہوتا ہے، ہر ایسٹر سے پہلے پورے چالیس دن فاقہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ پورے ایک سال تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ بسا اوقات وہ اپنی خانقاہ سے نکل کر ایک کنوئیں میں جا رہتا تھا۔ آخر کار اس نے شمالی شام کے قلعہ سمان کے قریب ۶۰ فیٹ بلند ایک ستون بنوایا جس کا بالائی حصہ صرف تین فیٹ کے گھیر میں تھا اور اُوپر کٹہرا بنا دیا گیا تھا۔ اس

ستون پر اس نے پورے تیس سال گزار دیے ۔ دھوپ ، بارش ، سردی ، گرمی سب اس پر سے گزرتی رہتی تھیں اور وہ کبھی ستون سے نہ اترتا تھا ۔ اس کے مرید سیڑھی لگا کر اس کو کھانا پہنچاتے اور اس کی گندگی صاف کرتے تھے ۔ پھر اس نے ایک رسّی لے کر اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ لیا یہاں تک کہ رسّی سے اس کا گوشت سڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے ۔ جب کوئی کیڑا اس کے پھوڑوں سے گر جاتا تو وہ اسے اٹھا کر پھر پھوڑے ہی میں رکھ لیتا اور کہتا " کھا جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے ۔" مسیحی عوام دُور دُور سے اس کی زیارت کے لیے آتے تھے ۔ جب وہ مرا تو مسیحی عوام کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ عیسائی ولی کی بہترین مثال تھا ۔

اسی دَور کے عیسائی اولیاء کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں وہ ایسی ہی مثالوں سے بھری پڑی ہیں ۔ کسی ولی کی تعریف یہ تھی کہ ۳۰ سال تک وہ بالکل خاموش رہا اور کبھی اسے بولتے نہ دیکھا ۔ کسی نے اپنے آپ کو ایک چٹان سے باندھ رکھا تھا ۔ کوئی جنگلوں میں مارا مارا پھرتا اور گھاس پھونس کھا کر گزارا کرتا ۔ کوئی بھاری بوجھ ہر وقت اُٹھائے پھرتا ۔ کوئی طوق و سلاسل سے اپنے اعضاء جکڑے رکھتا ۔ کچھ حضرات جانوروں کے بھٹوں ، یا خشک کنوؤں ، یا پرانی قبروں میں رہتے تھے ۔ اور کچھ دُوسرے بزرگ ہر وقت ننگے رہتے اور اپنا ستر اپنے لمبے لمبے بالوں سے چھپاتے اور زمین پر رینگ کر چلتے تھے ۔ ایسے ہی ولیوں کی کرامات کے چرچے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے ۔ اور ان کے مرنے کے بعد ان کی ہڈیاں خانقاہوں میں محفوظ رکھی جاتی تھیں ۔ میں نے خود کوہ سینا کے نیچے سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں ایسی ہی ہڈیوں کی ایک پوری لائبریری سجی ہوئی دیکھی ہے جس میں کہیں اولیاء کی کھوپڑیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں ، کہیں پاؤں کی ہڈیاں ، اور کہیں ہاتھوں کی ہڈیاں اور ایک ولی کا تو پورا ڈھانچہ ہی شیشے کی ایک الماری میں رکھا ہوا تھا ۔

## ۲ ۔ ترکِ طہارت و نظافت

ان کی دُوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت گندے رہتے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے ۔ نہانا یا جسم کو پانی لگانا ان کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا ۔ جسم کی صفائی کو وہ روح کی نجاست سمجھتے تھے ۔ سینٹ اتھاناسیوس بڑی عقیدت کے ساتھ سینٹ اینتھنی کی یہ خوبی بیان کرتا ہے کہ اُس نے مرتے دم تک کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے ۔ سینٹ ابراہام جب سے داخلِ مسیحیت ہُوا ، پورے پچاس سال تک اُس نے نہ مُنہ دھویا نہ پاؤں ۔ ایک مشہور راہبہ کنواری سلویا نے عمر بھر اپنی انگلیوں کے سوا جسم کے

کسی حصّے کو پانی نہیں لگنے دیا۔ ایک کانونیٹ کی ۱۳۰ راہبات کی تعریف میں لکھا ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے اور غسل کا تو نام سُن کر ہی ان کے بدن پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

## ۳۔ ازدواجی زندگی سے احتراز

اس رہبانیت نے ازدواجی زندگی کو عملاً بالکل حرام کر دیا اور نکاح کے رشتے کو کاٹ پھینکنے میں سخت بیدردی سے کام لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی کی تمام تحریریں اس خیال سے بھری ہوئی ہیں کہ تجرّد سب سے بڑی اخلاقی قدر ہے، اور عفت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی جنسی تعلق سے قطعی احتراز کرے، خواہ وہ میاں اور بیوی کا تعلق ہی کیوں نہ ہو۔ پاکیزہ روحانی زندگی کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنے نفس کو بالکل مار دے اور اس میں جسمانی لذت کی کوئی خواہش تک باقی نہ چھوڑے۔ ان لوگوں کے نزدیک خواہش کو مار دینا اس لیے ضروری تھا کہ اس سے حیوانیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ ان کے نزدیک لذت اور گناہ ہم معنی تھے، حتیٰ کہ مسرّت بھی ان کی نگاہ میں خدا فراموشی کی مترادف تھی۔ سینٹ باسل ہنسنے اور مسکرانے تک کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ انہی تصورات کی بنا پر عورت اور مرد کے درمیان شادی کا تعلق انکے ہاں قطعی نجس قرار پاگیا تھا۔ راہب کے لیے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار، عورت کی شکل تک نہ دیکھے، اور اگر شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھوڑ کر نکل جائے۔ مردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ وہ اگر آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ کنواری رہیں، اور شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہروں سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جیرُوم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ جو عورت مسیح کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہے وہ مسیح کی دُلہن ہے اور اس عورت کی ماں کو خدا، یعنی مسیحؑ، کی ساس MOTHER-IN-LAW OF GOD ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک اور مقام پر سینٹ جیرُوم کہتا ہے کہ "عفت کی کلہاڑی سے ازدواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا سالک کا اوّلین کام ہے۔" ان تعلیمات کی وجہ سے مذہبی جذبہ طاری ہونے کے بعد ایک مسیحی مرد یا ایک مسیحی عورت پر اس کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کی خوش گوار ازدواجی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی تھی۔ اور چونکہ مسیحیت میں طلاق و تفریق کا راستہ بند تھا، اس لیے نکاح کے رشتے میں رہتے ہوئے میاں اور بیوی ایک دُوسرے سے جُدا ہو جاتے تھے۔ سینٹ نائلس ST. NILUS دو بچوں کا باپ تھا۔ اس پر رہبانیت کا دورہ پڑا تو اس کی بیوی روتی رہ گئی اور وہ اس سے الگ ہو گیا۔ سینٹ امُّون ST. AMMON نے شادی کی پہلی رات ہی اپنی دُلہن کو ازدواجی تعلق کی نجاست پر وعظ فرمایا،

اور دونوں نے بالاتفاق یہ طے کر لیا کہ جیتے جی ایک دُوسرے سے الگ رہیں گے۔ سینٹ ابراہام شادی کی پہلی رات ہی اپنی بیوی کو چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ یہی حرکت سینٹ ایلیکسس ST. ALEXIS نے کی۔ اس طرح کے واقعات سے عیسائی اولیاء کے تذکرے بھرے پڑے ہیں

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک اپنے حدود میں ان انتہا پسندانہ تصورات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا۔ اس زمانے میں ایک پادری کے لیے مجرد ہونا لازم نہ تھا۔ اگر اس نے پادری کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے شادی کر رکھی ہو تو وہ بیوی کے ساتھ رہ سکتا تھا، البتہ تقرر کے بعد شادی کرنا اس کے لیے ممنوع تھا۔ نیز کسی ایسے شخص کو پادری مقرر نہیں کیا جاتا تھا جس نے کسی بیوہ یا مطلقہ سے شادی کی ہو، یا جس کی دو بیویاں ہوں یا جس کے گھر میں لونڈی ہو۔ رفتہ رفتہ چوتھی صدی میں یہ خیال پوری طرح زور پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو اس کے لیے شادی شدہ ہونا بڑی گھناؤنی بات ہے۔ ۳۶۲ء کی گنگرا کونسل COUNCIL OF GENGRA آخری مجلس تھی جس میں اس طرح کے خیالات کو خلافِ مذہب ٹھہرایا گیا۔ مگر اس کے تھوڑی ہی مدت بعد ۳۸۶ء کی رومن سیناڈ SYNOD نے تمام پادریوں کو مشورہ دیا کہ وہ ازدواجی تعلقات سے کنارہ کش رہیں۔ اور دوسرے سال پوپ سائریکس SIRICIUS نے حکم دیا کہ جو پادری شادی کرے، یا شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنی بیوی سے تعلق رکھے، اس کو منصب سے معزول کر دیا جائے۔ سینٹ جیرُوم، سینٹ ایمبروز، اور سینٹ آگسٹائن جیسے اکابر علماء نے بڑے زور و شور سے اس فیصلے کی حمایت کی اور تھوڑی سی مزاحمت کے بعد مغربی کلیسا میں یہ پوری شدت کے ساتھ نافذ ہو گیا۔ اس دُور میں متعدد کونسلیں ان شکایات پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئیں کہ جو لوگ پہلے شادی شدہ تھے وہ مذہبی خدمات پر مقرر ہونے کے بعد بھی اپنی بیویوں کے ساتھ "ناجائز" تعلقات رکھتے ہیں۔ آخر کار ان کی اصلاح کے لیے یہ قواعد بنائے گئے کہ وہ کھُلے مقامات پر سوئیں۔ اپنی بیویوں سے کبھی علیحدگی میں نہ ملیں اور ان کی ملاقات کے وقت کم از کم دو آدمی موجود ہوں۔ سینٹ گریگوری ایک پادری کی تعریف میں لکھتا ہے کہ ۴۰ سال تک وہ اپنی بیوی سے الگ رہا۔ حتّٰی کہ مرتے وقت جب اس کی بیوی اس کے قریب گئی تو اُس نے کہا، عورت، دُور ہٹ جا!

## ۴۔ قطع رحمی اور قرابتوں کا خاتمہ

سب سے زیادہ دردناک باب اس رہبانیّت کا یہ ہے کہ اس نے ماں باپ، بھائی بہنوں اور

اولاد تک سے آدمی کا رشتہ کاٹ دیا۔ مسیحی ولیوں کی نگاہ میں بیٹے کے لیے ماں کی محبت، بھائی کے لیے بھائی بہنوں کی محبت اور باپ کے لیے اولاد کی محبت بھی ایک گناہ تھی۔ ان کے نزدیک روحانی ترقی کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ آدمی ان سارے تعلقات کو توڑ دے۔ مسیحی اولیاء کے تذکروں میں ایسے ایسے دلدوز واقعات ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر انسان کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک راہب ایواگریوس EVAGRIUS سالہا سال سے صحرا میں ریاضتیں کر رہا تھا۔ ایک روز یکایک اس کے پاس اس کی ماں اور اس کے باپ کے خطوط پہنچے جو برسوں سے اس کی جدائی میں تڑپ رہے تھے۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے خطوط کو پڑھ کر اس کے دل میں انسانی محبت کے جذبات نہ جاگ اٹھیں۔ اس نے ان کو کھولے بغیر فوراً آگ میں جھونک دیا۔ سینٹ تھیوڈورس کی ماں اور بہن بہت سے پادریوں کے سفارشی خطوط لے کر اس خانقاہ میں پہنچیں جہاں وہ مقیم تھا اور خواہش کی کہ وہ صرف ایک نظر بیٹے اور بھائی کو دیکھ لیں۔ مگر اُس نے اُن کے سامنے آنے تک سے انکار کر دیا۔ سینٹ مارکس ST. MARCUS کی ماں اس سے ملنے کے لیے اس کی خانقاہ میں گئی۔ خانقاہ کے شیخ ABBOT کی خوشامدیں کر کے اس کو راضی کیا کہ وہ بیٹے کو ماں کے سامنے آنے کا حکم دے۔ مگر بیٹا کسی طرح ماں سے نہ ملنا چاہتا تھا۔ آخر کار اُس نے شیخ کے حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ بھیس بدل کر ماں کے سامنے آ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس طرح نہ ماں نے بیٹے کو پہچانا نہ بیٹے نے ماں کی شکل دیکھی۔ ایک اور ولی سینٹ پوئمن ST. POEMEN اور اس کے چھ بھائی مصر کی ایک صحرائی خانقاہ میں رہتے تھے۔ برسوں بعد ان کی بوڑھی ماں کو ان کا پتہ معلوم ہوا اور وہ ان سے ملنے کے لیے وہاں پہنچی۔ بیٹے ماں کو دُور سے دیکھتے ہی بھاگ کر اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ ماں باہر بیٹھ کر رونے لگی اور اس نے چیخ چیخ کر کہا کہ میں اس بڑھاپے میں اتنی دُور سے چل کر صرف تمھیں دیکھنے آئی ہوں، تمھارا کیا نقصان ہوگا اگر میں تمھاری شکلیں دیکھ لوں۔ کیا میں تمھاری ماں نہیں ہوں؟ مگر ان ولیوں نے دروازہ نہ کھولا اور ماں سے کہہ دیا کہ ہم تجھ سے خدا کے ہاں ملیں گے۔ اس سے بھی زیادہ دردناک قصہ سینٹ سیمیون اسٹائلائٹس ST. SIMEON STYLITES کا ہے جو ماں باپ کو چھوڑ کر ۲۷ سال غائب رہا۔ باپ اس کے غم میں مر گیا۔ ماں زندہ تھی۔ بیٹے کی ولایت کے چرچے جب دُور و نزدیک پھیل گئے تو اس کو پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ بے چاری اس سے ملنے کے لیے اس کی خانقاہ پر پہنچی مگر وہاں کسی عورت کو داخلے کی اجازت نہ تھی۔ اس نے لاکھ منت سماجت کی کہ بیٹا یا تو اسے اندر بلا لے یا باہر نکل کر اسے اپنی صورت دکھا دے۔ مگر اس ولی اللہ نے صاف انکار کر دیا۔ تین دن اور

تین رات وہ خانقاہ کے دروازے پر پڑی رہی اور آخر کار وہیں لیٹ کر اُس نے جان دے دی۔ تب ولی صاحب نکل کر آئے۔ ماں کی لاش پر آنسو بہائے اور اس کی مغفرت کے لیے دُعا کی۔

ایسی ہی بے دردی ان ولیوں نے بہنوں کے ساتھ اور اپنی اولاد کے ساتھ برتی۔ ایک شخص میوٹیس MUTIUS کا قصہ لکھا ہے کہ وہ خوشحال آدمی تھا۔ یکایک اس پر مذہبی جذبہ طاری ہوا اور وہ اپنے ۸ سال کے اکلوتے بیٹے کو لیکر ایک خانقاہ میں جا پہنچا۔ وہاں اس کی روحانی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیٹے کی محبت دل سے نکال دے۔ اس لیے پہلے تو بیٹے کو اس سے جُدا کر دیا گیا۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مدت تک طرح طرح کی سختیاں اس معصوم بچے پر کی جاتی رہیں اور وہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خانقاہ کے شیخ نے اسے حکم دیا کہ اسے لے جاکر اپنے ہاتھ سے دریا میں پھینک دے۔ جب وہ اس حکم کی تعمیل کے لیے بھی تیار ہوگیا تو عین اُس وقت راہبوں نے بچے کی جان بچائی جب وہ اسے دریا میں پھینکنے لگا تھا۔ اس کے بعد تسلیم کر لیا گیا کہ وہ واقعی مرتبۂ ولایت کو پہنچ گیا ہے۔

مسیحی رہبانیت کا نقطۂ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبت چاہتا ہو اسے انسانی محبت کی وہ ساری زنجیریں کاٹ دینی چاہئیں جو دُنیا میں اس کو اپنے والدین، بھائی بہنوں اور بال بچوں کے ساتھ باندھتی ہیں۔ سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "اگرچہ تیرا بھتیجا تیرے گلے میں بانہیں ڈال کر تجھ سے لپٹے، اگرچہ تیری ماں اپنے دُودھ کا واسطہ دے کر تجھے روکے، اگرچہ تیرا باپ تجھے روکنے کے لیے تیرے آگے لیٹ جائے، پھر بھی تُو سب کو چھوڑ کر اور باپ کے جسم کو روند کر ایک آنسو بہائے بغیر صلیب کے جھنڈے کی طرف لوٹ جا۔ اس معاملے میں بے رحمی ہی تقویٰ ہے۔"

سینٹ گریگوری لکھتا ہے کہ "ایک نوجوان راہب ماں باپ کی محبت دل سے نہ نکال سکا اور ایک رات چپکے سے بھاگ کر ان سے مل آیا۔ خدا نے اس قصور کی سزا اسے یہ دی کہ خانقاہ واپس پہنچتے ہی وہ مر گیا۔ اس کی لاش زمین میں دفن کی گئی تو زمین نے اسے قبول نہ کیا۔ بار بار قبر میں ڈالا جاتا اور زمین اسے نکال کر پھینک دیتی۔ آخر کار بینیڈکٹ نے اس کے سینے پر تبرک رکھا تب قبر نے اسے قبول کیا۔"

ایک راہبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مرنے کے بعد تین دن عذاب میں اس لیے مبتلا رہی کہ وہ اپنی ماں کی محبت دل سے نہ نکال سکی تھی۔ ایک ولی کی تعریف میں لکھا ہے کہ اس نے کبھی اپنے رشتہ داروں کے سوا کسی کے ساتھ بے دردی نہیں برتی۔

## ۵۔ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ظلم و تعدّی

اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی، سنگ دلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے، اس کی وجہ سے ان کے انسانی جذبات مر جاتے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انھیں مذہبی اختلاف ہوتا تھا ان کے مقابلے میں یہ ظلم و ستم کی انتہا کر دیتے تھے۔ چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیت میں ۸۰۔۹۰ فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنے زمانے میں ۸۸ فرقے گنائے ہیں۔ یہ فرقے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب ہی تھے اور اس آگ میں مخالف گروہوں کو جلا کر خاک کر دینے کی کوششوں میں بھی راہب پیش پیش ہوتے تھے۔ اسکندریہ اس فرقہ وارانہ کشمکش کا ایک بڑا اکھاڑا تھا۔ وہاں پہلے ایرین ARIAN فرقے کے بشپ نے اتھاناسیوس کی پارٹی پر حملہ کیا، اس کی خانقاہوں سے کنواری راہبات پکڑ پکڑ کر نکالی گئیں، اُن کو ننگا کر کے خاردار شاخوں سے پیٹا گیا اور ان کے جسم پر داغ لگائے گئے تاکہ وہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔ پھر جب مصر میں کیتھولک گروہ کو غلبہ حاصل ہوا تو اس نے ایرین فرقے کے خلاف یہی سب کچھ کیا، حتّٰی کہ غالب خیال یہ ہے کہ خود ایریس ARIUS کو بھی زہر دے کر مار دیا گیا۔ اسی اسکندریہ میں ایک مرتبہ سینٹ سائرل ST. SYRIL کے مرید راہبوں نے ہنگامۂ عظیم برپا کیا، یہاں تک کہ مخالف فرقے کی ایک راہبہ کو پکڑ کر اپنے کلیسا میں لے گئے، اسے قتل کیا، اس کی لاش کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی اور پھر اُسے آگ میں جھونک دیا۔ روم کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ ۳۶۶ء میں پوپ لبیریس LIBERIUS کی وفات پر دو گروہوں نے اپنے اپنے اُمیدوار کھڑے کیے۔ دونوں کے درمیان سخت خونریزی ہوئی حتّٰی کہ ایک دن صرف ایک چرچ سے ۱۳۷ لاشیں نکالی گئیں۔

## ۶۔ ترک و تجرّد کے ساتھ دنیا پرستی

اس ترک و تجرّد اور فقر و درویشی کے ساتھ دولتِ دنیا سمیٹنے میں بھی کمی نہ کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز ہی میں یہ حالت ہو چکی تھی کہ روم کا بشپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔ سینٹ جیروم اپنے زمانے (چوتھی صدی کے آخری دور) میں شکایت کرتا ہے کہ بہت سے بشپوں کی دعوتیں اپنی شان میں گورنروں کی دعوتوں کو شرماتی ہیں۔ خانقاہوں اور کنیسوں کی طرف دولت کا یہ بہاؤ ساتویں صدی (نزولِ قرآن کے زمانے) تک پہنچتے پہنچتے

سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ بات عوام کے ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ جس کسی سے کوئی گناہِ عظیم سرزد ہو جائے اس کی بخشش کسی نہ کسی ولی کی درگاہ پر نذرانہ چڑھانے، یا کسی خانقاہ یا چرچ کو بھینٹ دینے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد وہی دُنیا راہبوں کے قدموں میں آ رہی جس سے فرار ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ خاص طور پر جو چیز اس تنزل کی موجب ہوئی، وہ یہ تھی کہ راہبوں کی غیر معمولی ریاضتوں اور ان کی نفس کشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں ان کے لیے بے پناہ عقیدت پیدا ہو گئی تو بہت سے دُنیا پرست لوگ لباسِ درویشی پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے اور اُنھوں نے ترکِ دُنیا کے بھیس میں جلبِ دُنیا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبینِ دُنیا اُن سے مات کھا گئے۔

## ۸۔ خانقاہوں میں فحاشی کے اڈے

عفت کے معاملہ میں بھی فطرت سے لڑ کر رہبانیت نے بارہا شکست کھائی اور جب شکست کھائی تو بُری طرح کھائی۔ خانقاہوں میں نفس کشی کی کچھ مشقیں ایسی بھی تھیں جن میں راہب اور راہبات مل کر ایک ہی جگہ رہتے تھے اور بسا اوقات ذرا زیادہ مشق کرنے کے لیے ایک ہی بستر پر رات گزارتے تھے۔ مشہور راہب سینٹ ایواگریس ST. EVAGRIUS بڑی تعریف کے ساتھ فلسطین کے ان راہبوں کے ضبطِ نفس کا ذکر کرتا ہے جو "اپنے جذبات پر اتنا قابو پا گئے تھے کہ عورتوں کے ساتھ یک جا غسل کرتے تھے اور اُن کی دید سے، اُن کے لمس سے، حتیٰ کہ ان کے ساتھ ہم آغوشی سے بھی اُن کے اُوپر فطرت غلبہ نہ پاتی تھی"۔ غسل اگرچہ رہبانیت میں سخت ناپسندیدہ تھا مگر نفس کُشی کی مشق کے لیے اس طرح کے غسل بھی کر لیے جاتے تھے۔ آخر کار اسی فلسطین کے متعلق نیسا NYSSA کا سینٹ گریگوری متوفی ۳۹۶ء لکھتا ہے کہ وہ بدکرداری کا اڈہ بن گیا ہے۔ انسانی فطرت کبھی اُن لوگوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہتی جو اس سے جنگ کریں۔ رہبانیت اس سے لڑ کر بالآخر بداخلاقی کے جس گڑھے میں جا گری اس کی داستان آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بدنما داغ ہے۔ دسویں صدی کا ایک اطالوی بشپ لکھتا ہے کہ "اگر چرچ میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے خلاف بدچلنی کی سزائیں نافذ کرنے کا قانون عملاً جاری کر دیا جائے تو لڑکوں کے سوا کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا، اور اگر حرامی بچوں کو بھی مذہبی خدمات سے الگ کر دینے کا قاعدہ نافذ کیا جائے تو شاید چرچ کے خادموں میں کوئی لڑکا تک باقی نہ رہے"۔ قرونِ متوسط کے مصنفین کی کتابیں ان شکایتوں سے بھری پڑی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بداخلاقی کے چکلے بن گئی ہیں۔

ان کی چار دیواریوں میں نوزائیدہ بچوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے، پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں محرمات تک سے ناجائز تعلقات اور خانقاہوں میں خلافِ وضع فطری جرائم تک پھیل گئے ہیں، اور کلیساؤں میں اعترافِ گناہ CONFESSION کی رسم بدکرداری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔

ان تفصیلات سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید یہاں رہبانیت کی بدعت ایجاد کرنے اور پھر اس کا حق ادا نہ کرنے کا ذکر کر کے مسیحیت کے کس بگاڑ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ (۴۳)

ملاحظہ ہو سورۂ الحدید۔ آیت ۲۷ :

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۖ



ترجمہ: "ان کے بعد ہم نے پے در پے ___ اپنے رسول بھیجے، اور ان سب کے بعد عیسیٰؑ بن مریم کو مبعوث کیا اور اس کو انجیل عطا کی، اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے عطا کیا، مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔"

## باب ۵

# عیسائیوں کی تاریخ کے چند اہم اجزا

فصل ا

# اصحابِ اُخدود

قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ (بروج-آیت ۴)

ترجمہ: مارے گئے گڑھے والے

گڑھوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو ان میں پھینکنے کے متعدد واقعات روایات میں بیان ہوئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں کئی مرتبہ اس طرح کے مظالم کیے گئے ہیں۔

## حضرت صہیب رومیؓ کی روایت

ان میں سے ایک واقعہ حضرت صہیب رومیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اس نے اپنے بڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کر دے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مامور کر دیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیروانِ مسیح علیہ السلام میں سے تھا) ملنے لگا، اور اس کی باتوں سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا، حتیٰ کہ اس کی تربیت سے صاحبِ کرامت ہو گیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے تو اُس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا، پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا۔ مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اس پر کارگر نہ ہوا۔ آخر کار لڑکے نے کہا، اگر تو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمع عام میں باسم ربّ الغلام (اس لڑکے کے رب کے نام پر) کہہ کر مجھے تیر مار، میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔ اس پر لوگ پکار اُٹھے کہ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے اس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہو گیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر غصّے میں بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے، ان میں آگ بھروائی، اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا اس کو آگ میں پھکوا دیا (احمد، مسلم، نسائی، ترمذی،

ابن جریر۔ عبدالرزاق۔ ابنِ ابی شیبہ۔ طبرانی۔ عبد بن حمید)

## حضرت علیؓ کی بیان کردہ روایت

دوسرا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات استوار ہو گئے۔ بات کھُلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کر دیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اس شخص کو پھکواتا چلا گیا جس نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ اسی وقت سے مجوسیوں میں محرمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے۔ (ابنِ جریر)

## حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت

تیسرا واقعہ ابنِ عباسؓ نے غالباً اسرائیلی روایت سے نقل کیا ہے کہ بابل والوں نے بنی اسرائیل کو دینِ موسیٰ علیہ السلام سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ان لوگوں کو پھینک دیا جو اس سے انکار کرتے تھے۔ (ابنِ جریر۔ عبد بن حمید)

## اسلامی مؤرخین کا بیان

سب سے مشہور واقعہ نجران کا ہے جسے ابنِ ہشام، طبری، ابنِ خلدون اور صاحب مُعجَم البُلدان وغیرہ اسلامی مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حِمیَر (یمن کا بادشاہ) تبان اسعد، ابوکرب ایک مرتبہ یثرب گیا، جہاں یہودیوں سے متأثر ہو کر اس نے دینِ یہود قبول کر لیا اور بنی قُریظہ کے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ اس کا بیٹا ذونواس اس کا جانشین ہوا اور اس نے نجران پر (جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا) حملہ کیا تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کر دے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ (ابنِ ہشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے اصل دین پر قائم تھے) نجران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دینِ یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انھوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کر دیا، یہاں تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اہلِ نجران میں سے ایک شخص دوس ذُوثُعلبان بھاگ نکلا اور ایک روایت کی رُو سے اس نے قیصرِ روم کے پاس جا کر، اور دُوسری روایت کی رُو سے حبش

کے بادشاہ نجاشی کے ہاں جا کر اس ظلم کی شکایت کی۔ پہلی روایت کی رُو سے قیصر نے حبش کے بادشاہ کو لکھا اور دوسری روایت کی رُو سے نجاشی نے قیصر سے بحری بیڑہ فراہم کرنے کی درخواست کی۔ بہر حال آخر کار حبش کی ۷۰ ہزار فوج ارباط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی ذو نواس مارا گیا یہودی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

اسلامی مؤرخین کے بیانات کی نہ صرف تصدیق دوسرے تاریخی ذرائع سے ہوتی ہے بلکہ ان سے بہت سی مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یمن پر سب سے پہلے عیسائی حبشیوں کا قبضہ ۳۴۰ء میں ہوا تھا اور ۳۷۸ء تک جاری رہا۔ اس زمانے میں عیسائی مشنری یمن میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ اسی کے قریب دور میں ایک زاہد و مجاہد اور صاحبِ کشف و کرامت عیسائی سیاح فیمیون FAMIYUN نامی نجران پہنچا اور اس نے وہاں کے لوگوں کو بت پرستی کی برائی سمجھائی اور اس کی تبلیغ سے اہلِ نجران عیسائی ہوگئے۔ ان لوگوں کا نظام تین سردار چلاتے تھے۔ ایک سید، جو قبائلی شیوخ کی طرح بڑا سردار اور خارجی معاملات، معاہدات اور فوجوں کی قیادت کا ذمہ دار تھا۔ دوسرا عاقب، جو داخلی معاملات کا نگراں تھا۔ اور تیسرا اسقف (بشپ) جو مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔ جنوبی عرب میں نجران کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ ٹسر، چمڑے اور اسلحہ کی صنعتیں یہاں چل رہی تھیں۔ مشہور حُلّہ یمانی بھی یہیں تیار ہوتا تھا۔ اسی بنا پر محض مذہبی وجوہ ہی سے نہیں، بلکہ سیاسی اور معاشی وجوہ سے بھی ذُو نواس نے اس اہم مقام پر حملہ کیا۔ نجران کے سید حارثہ کو جسے سُریانی مؤرخین ARETHAS لکھتے ہیں، قتل کیا۔ اس کی بیوی رومہ کے سامنے اس کی دو بیٹیوں کو مار ڈالا اور اسے ان کا خون پینے پر مجبور کیا، پھر اسے قتل بھی کر دیا۔ اُسقف پال PAUL کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلا دیں۔ اور آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں عورت، مرد، بچے، بوڑھے، پادری، راہب سب کو پھکوا دیا۔ مجموعی طور پر بیس سے چالیس ہزار تک مقتولین کی تعداد بیان کی جاتی ہے۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۳ء میں پیش آیا تھا۔ آخر کار ۵۲۵ء میں حبشیوں نے یمن پر حملہ کرکے ذُو نواس اور اس کی حمیری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی تصدیق حصنِ غراب کے کتبے سے ہوتی ہے جو یمن میں موجودہ زمانے کے محققین آثارِ قدیمہ کو ملا ہے۔

## واقعۂ اصحاب الاخدود کے عینی شاہد

چھٹی صدی عیسوی کی متعدد عیسائی تحریرات میں اصحاب الاخدود کے اس واقعہ کی تفصیلات بیان

ہوئی ہیں جن میں سے بعض عین زمانہ حادثہ کی لکھی ہوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سُن کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں کے مصنف اس واقعہ کے ہمعصر ہیں۔ ایک پروکوپیوس، دوسرا کوسماس انڈیکوپلیوسٹس COSMAS INDICOPLEUSTIS جو نجاشی ایلیسبوعان ELAS BOAN کے حکم سے اس زمانے میں بطلیموس کی یونانی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا اور حبش کے ساحلی شہر اُدولیس ADOLIS میں مقیم تھا۔ تیسرا یوحنّس ملالا JOHANNES MALALA جس سے بعد کے متعدد مؤرخین نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یوحنّس افسوسی JOHANNES OF EPHESUS متوفی ۵۸۵ء نے اپنی تاریخ کنیسہ میں نصاریٰ نجران کی تعذیب کا قصہ اس واقعہ کے معاصر راوی اُسقف مارشمعون SIMEON کے ایک خط سے نقل کیا ہے جو اس نے دَیرِ جَبلہ کے رئیس ABBOT VON GABULA کے نام لکھا تھا، اور مارشمعون نے اپنے خط میں یہ واقعہ اُن اہلِ یمن کے آنکھوں دیکھے بیان سے روایت کیا ہے جو اس موقع پر موجود تھے۔ یہ خط ۱۸۸۱ء میں روم سے اور ۱۸۹۰ء میں شہدائے مسیحیت کے حالات کے سلسلے میں شائع ہوا ہے۔ یعقوبی بطریق ڈایونیسیوس PATRIARCH DIONYSIUS اور زکریا مدیلی ZACHARIA OF MITYLENE نے اپنی سُریانی تاریخوں میں بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ یعقوب سُروجی کی کتاب دربابِ نصاریٰ نجران میں بھی یہ ذکر موجود ہے۔ الرّھا EDESSA کے اُسقف پولس PULUS نے نجران کے ہلاک شدگان کا مرثیہ لکھا جو اب بھی دستیاب ہے۔ سُریانی زبان کی تصنیف کتاب "الحمیریین" BOOK OF THE HIMYARITES کا انگریزی ترجمہ ۱۹۲۴ء میں لندن سے شائع ہوا ہے اور وہ مسلمان مؤرخین کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ برٹش میوزیم میں اس عہد اور اس سے قریبی عہد کے کچھ حبشی مخطوطات بھی موجود ہیں جو اس قصے کی تائید کرتے ہیں۔ فلبی نے اپنے سفرنامے ARABIAN HIGHLANDS میں لکھا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے جہاں اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا۔ اُمِ خرق کے پاس ایک جگہ چٹانوں میں کھدی ہوئی کچھ تصویریں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور کعبۂ نجران جس جگہ واقع تھا اس کو بھی آج کل کے اہلِ نجران جانتے ہیں۔

## کعبۂ نجران کی تعمیر

حبشی عیسائیوں نے نجران پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کعبہ کی شکل کی ایک عمارت بنائی جسے وہ مکہ کے کعبہ کی جگہ مرکزی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ اس کے اساقفہ عمامے باندھتے تھے۔ اور اس کو حرم قرار

دیا گیا تھا۔ رومی سلطنت بھی اس کعبے کے لیے مالی اعانت بھیجتی تھی۔ اسی کعبۂ نجران کے پادری اپنے سیّد اور عاقب اور اسقف کی قیادت میں مناظرے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور مُباہلہ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر سورۂ آلِ عمران آیت ۶۱ میں کیا گیا ہے۔ (۴۴)

فصل ۲

# واقعہ اصحابِ کہف

مشرکینِ مکّہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے اہلِ کتاب کے مشورے سے آپؐ کے سامنے تین سوالات پیش کیے تھے: اصحابِ کہف کون تھے؟ قصّۂ خضر کی حقیقت کیا ہے؟ اور ذوالقرنین کا کیا قصّہ ہے؟ یہ تینوں قصّے عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخ سے متعلق تھے۔ حجاز میں اُن کا کوئی چرچا نہ تھا۔ اسی لیے اہلِ کتاب نے امتحان کی غرض سے ان کا انتخاب کیا تھا تاکہ یہ بات کھُل جائے کہ واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی غیبی ذریعۂ علم ہے یا نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ اپنے نبیؐ کی زبان سے ان کے سوالات کا پُورا جواب دیا، بلکہ ان کے اپنے پوچھے ہوئے تینوں قصّوں کو پوری طرح اس صورتِ حال پر چسپاں بھی کر دیا جو اس وقت مکّہ میں کفر و اسلام کے درمیان درپیش تھی

(از مؤلف)

## کہف و رقیم کی بحث

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ (الکھف، آیت ۹-۱۰)

ترجمہ: "کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اے پروردگار ہم کو اپنی رحمتِ خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے۔"

عربی زبان میں "کہف" وسیع غار کو کہتے ہیں اور "غار" کا لفظ تنگ کھوہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر اُردو میں غار کہف کا ہم معنی ہے۔

الرقیم کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض صحابہ وتابعین سے منقول ہے کہ یہ اُسی بستی کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اور وہ ایلہ (یعنی عقبہ) اور فلسطین کے درمیان واقع تھی، اور بعض قدیم مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کتبہ ہے جو اس غار پر اصحاب کہف کی یادگار میں لگایا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان" میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقام وہی ہے جسے بائبل کی کتاب یشوع (باب ۱۸۔ آیت ۲۷) میں رقم یا راقم کہا گیا ہے۔ پھر وہ اسے نبطیوں کے مشہور تاریخی مرکز پیٹرا کا قدیم نام قرار دیتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ کتاب یشوع میں رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے اور خود اسی کتاب کے بیان کی رُو سے اس قبیلے کی میراث کا علاقہ دریائے اُردن اور بحرِ لوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں پیٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پیٹرا کے کھنڈر جس علاقے میں پائے جاتے ہیں اسکے اور بنی بن یمین کی میراث کے درمیان تو یہودا اور اَدُومیہ کا پورا علاقہ حائل تھا۔ اسی بنا پر جدید زمانے کے محققینِ آثارِ قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع ۱۹۴۶ء جلد ۷، ص ۶۵۸) ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقیم سے مراد کتبہ ہے۔ (۴۵)

فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى (الکہف آیات ۱۱ تا ۱۳)

ترجمہ: "تو ہم نے انھیں اُسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سلادیا، پھر ہم نے انھیں اُٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے۔ ہم ان کا قصہ تمھیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔"

## قصّے کی قدیم ترین شہادت

اس قصّے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سُروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سُریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ شخص اصحاب کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا

تھا اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کیے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سُریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دَور کے مفسرین کو پہنچی جسے ابنِ جریر طبری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گبن نے اپنی کتاب "تاریخ زوال وسقوط دولتِ رُوم" کے باب ۳۳ میں "سات سونے والوں" SEVEN SLEEPERS کے عنوان کے تحت ان مآخذ سے اس قصّے کا جو خلاصہ دیا ہے وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصّے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظُلم سے بھاگ کر اصحابِ کہف غار میں پناہ گزین ہوئے تھے، ہمارے مفسرین اس کا نام دَقیُنوس یا دقیانوس یا دَقیُوس بتاتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈیسیس DECIUS تھا جس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنتِ روم پر فرمانروائی کی ہے اور مسیح علیہ السّلام کے پیروؤں پر ظلم کرنے کے معاملہ میں جس کا عہد بہت بدنام ہے۔ جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسرین اُفْسُس یا افسوس لکھتے ہیں اور گبن اس کا نام اِفسُس EPHESUS بتاتا ہے جو ایشائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈر آج موجودہ ٹرکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰ - ۲۵ میل بجانب جنوب پائے جاتے ہیں۔ پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحابِ کہف جاگے اس کا نام ہمارے مفسرین تیذوسیس لکھتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس ثانی THEODASIUS کے زمانے میں پیش آیا جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحابِ کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا اس کا نام ہمارے مفسرین یملیخا بتاتے ہیں اور گبن اسے یملیخس JAMBLICHUS لکھتا ہے۔

قصّے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈیسیس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السّلام کے پیروؤں پر سخت ظلم وستم ہو رہے تھے، یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے۔ پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال یعنی تقریباً ۴۲۵ء یا ۴۲۶ء میں یہ لوگ بیدار ہوئے جب کہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السّلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اس حساب میں غار میں ان کے رہنے کی مُدّت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔

## بعض مستشرقین کی اختلافی بحث

بعض مستشرقین نے اس قصّے کو اصحابِ کہف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن ان کے قیامِ غار کی مدّت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے۔

اس سُریانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گبن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر "جہالت" کا الزام لگایا ہے، حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اتنی بڑی جسارت کر رہا ہے، اس کے متعلق وہ خود مانتا ہے کہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے، اور اتنی مدّت کے اندر زبانی روایت کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے اس طرح کی ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جزو میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے صرف ان ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ (۴۶)

## محلِّ واقعہ اور اس کی تفصیلات

شہر افسوس EPHESUS جس میں اصحابِ کہف کا واقعہ پیش آیا، تقریباً گیارھویں صدی قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا اور بعد میں یہ بُت پرستی کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں چاند دیوی کی پُوجا ہوتی تھی جسے ڈائنا DIANA کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسی کا عظیم الشان مندر عہدِ قدیم کے عجائباتِ عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے اور رومی سلطنت نے بھی اس کو اپنے معبودوں میں شامل کر لیا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بعد جب مسیحی دعوت رومی سلطنت کے مختلف علاقوں میں پہنچنی شروع ہوئی تو اس شہر کے چند نوجوان بھی شرک سے تائب ہو کر خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔ ان کے قصّے کی جو تفصیلات مسیحی روایات کو جمع کر کے گریگوری آف ٹورس GREGORY OF TOURS نے اپنی کتاب MERACUL ORUM LIBER میں بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

یہ سات نوجوان تھے۔ ان کی تبدیلیٔ مذہب کا حال سُن کر قیصر ڈیسیس نے ان کو اپنے سامنے طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ قیصر پیروانِ مسیح کے خون کا پیاسا ہے مگر انھوں نے

کسی خوف کے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بہت بڑا گناہ کریں گے۔ قیصر نے پہلے تو سخت مشتعل ہو کر کہا کہ اپنی زبان بند کرو، ورنہ میں تمھیں قتل کرادوں گا۔ پھر کچھ ٹھنڈا ہوا اور بولا تم ابھی بچے ہو۔ میں تمھیں تین دن دیتا ہوں۔ اس مدت میں اگر تم نے اپنا رویہ بدل لیا اور اپنی قوم کے مذہب کی طرف پلٹ آئے تو خیر، ورنہ تمھاری گردن مار دی جائے گی۔



اس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر یہ ساتوں نوجوان شہر سے بھاگ نکلے اور انھوں نے پہاڑوں کی راہ لی تاکہ کسی غار میں جا چھپیں۔ راستے میں ایک کُتا ان کے ساتھ لگ گیا۔ انھوں نے بہتیری کوشش کی کہ وہ ان کا پیچھا چھوڑ دے، مگر وہ کسی طرح ان سے الگ نہ ہُوا۔ آخر کار ایک بڑے گہرے غار کو اچھی جائے پناہ دیکھ کر وہ اس میں چھُپ گئے اور کُتا اس کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ تھکے ماندے تھے اس لیے فوراً ہی سو گئے۔ یہ ۲۵۰ء کا واقعہ ہے۔ ۱۹۷ برس بعد ۴۴۷ عیسوی میں وہ یکایک بیدار ہوئے جب قیصر تھیوڈوسیس دوم کا عہدِ حکومت تھا، رومی سلطنت مسیحیت اختیار کر چکی تھی، اور شہر افسوس کے باشندے بھی بُت پرستی ترک کر چکے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رومی باشندوں کے درمیان زندگی بعد موت اور حشر و نشر کے معاملے میں سخت اختلاف برپا تھا اور قیصر اس بات پر بہت فکرمند تھا کہ لوگوں کے دلوں سے انکارِ آخرت کا خیال کیسے نکالا جائے۔ ایک روز اس نے خدا سے دُعا کی کہ وہ کوئی ایسی نشانی دکھا دے جس سے لوگ آخرت پر ایمان لے آئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک اُسی زمانے میں یہ نوجوان جاگ اُٹھے۔

بیدار ہو کر اُنھوں نے آپس میں پوچھا کتنی دیر ہم سوئے ہوں گے؟ کسی نے کہا دن بھر۔ کسی نے کہا دن کا کچھ حصّہ۔ پھر یہ کہہ کر سب خاموش ہو گئے کہ خُدا ہی بہتر جانتا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی جین کو چاندی کے چند سکّے دے کر کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اور اس سے کہا ذرا احتیاط سے کام لینا، کہیں لوگ تمھیں پہچان نہ جائیں۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر لوگوں کو ہمارا پتہ چل گیا تو وہ ہمیں پکڑ لے جائیں گے اور ڈائنا کی پرستش پر مجبور کریں گے۔ مگر جین جب شہر میں پہنچا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دُنیا بدلی ہوئی ہے۔ سب لوگ مسیحی ہو گئے ہیں اور ڈائنا کو پُوجنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ ایک دوکان پر پہنچ کر اُس نے روٹیاں خریدیں اور دکاندار کو چاندی کا ایک سکّہ دیا جس پر قیصر ڈیسیس کی تصویر تھی۔ دکاندار یہ سکّہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے پُوچھا یہ تمھیں کہاں سے ملا؟ جین نے کہا یہ میرا اپنا مال ہے، کہیں سے لایا نہیں ہوں۔ اس پر دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ حتیٰ کہ کوتوالِ شہر

تک معاملہ پہنچا۔ کوتوال نے کہا مجھے وہ دفینہ بتاؤ جہاں سے تم یہ سکہ لائے ہو۔ جین نے جواب دیا دفینہ کیسا؟ یہ میرا اپنا مال ہے میں کسی دفینے کو نہیں جانتا۔ کوتوال نے کہا تمھاری یہ بات ماننے کے قابل نہیں ہے۔ یہ تو صدیوں پرانا سکہ ہے۔ تم تو ابھی جوان لڑکے ہو، ہمارے بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی یہ سکہ نہیں دیکھا۔ یہ ضرور کوئی راز ہے۔ جین نے جب یہ سنا کہ قیصر ڈیسیس کو مرے زمانہ دراز گزر چکا ہے تو وہ دنگ رہ گیا اور کچھ دیر تک بالکل دم بخود رہا۔ پھر آہستہ سے بولا کل ہی تو میں اور میرے چھ ساتھی اس شہر سے بھاگ کر گئے تھے اور ایک غار میں ہم نے پناہ لی تھی تاکہ ڈیسیس کے ظلم سے بچ رہیں۔ جین کی یہ بات سُن کر کوتوال بھی حیران رہ گیا اور وہ اس کو لے کر اس غار کی طرف چلا جہاں اس کے بیان کے مطابق یہ لوگ چھپے ہوئے تھے۔ لوگوں کا ایک انبوہِ کثیر ان کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ امر پوری طرح تحقیق ہو گیا کہ یہ واقعی قیصر ڈیسیس کے زمانے کے لوگ ہیں۔ تھیوڈوسیس کو اس کی اطلاع دی گئی۔ وہ خود آکر ان سے ملا اور ان سے برکت لی۔ اس کے بعد یکایک یہ ساتوں آدمی غار میں جاکر لیٹے اور وفات پا گئے۔ اس صریح نشانی کو دیکھ کر لوگ مان گئے کہ واقعی موت کے بعد زندگی برحق ہے۔ پھر قیصر کے حکم سے اس غار پر ایک زیارت گاہ تعمیر کر دی گئی۔

## ایک اعتراض اور اس کا جواب

غار والوں کی یہ داستان جو مسیحی روایات میں بیان ہوئی ہے، قرآن کے بیان کردہ قصے سے اتنی مطابقت رکھتی ہے کہ انھی کو اصحابِ کہف قرار دینا بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قصہ ایشیائے کوچک کے ایک شہر کا ہے، اور قرآن اُن واقعات سے بحث نہیں کرتا جو سرزمینِ عرب کے باہر پیش آئے ہیں، اس لیے اس مسیحی قصے کو اصحابِ کہف پر چسپاں کرنا قرآن کے اسلوب سے انحراف ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ قرآن مجید میں دراصل جس بات کا التزام کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ عرب کو عبرت دلانے کے لیے ان قوموں اور طاقتوں کے حالات پر کلام کیا جائے جن سے وہ واقف تھے، قطع نظر اس سے کہ وہ سرزمینِ عرب کے حدود میں ہوں یا اس سے باہر۔ اسی بنا پر مصر کی قدیم تاریخ قرآن میں زیرِ بحث آئی ہے، حالانکہ وہ عرب کے باہر واقع ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب مصر کے حالات قرآن میں زیرِ بحث آسکتے ہیں تو روم کے کیوں نہ آسکتے تھے؟ اہلِ عرب جس طرح مصر سے واقف تھے اسی طرح روم سے بھی تو واقف تھے۔ رومی سلطنت کی سرحدیں عین حجاز کی شمالی سرحدوں سے ملی ہوئی تھیں۔ عربوں کے تجارتی قافلے شب و روز رومی علاقوں میں جاتے تھے۔ بہت سے عرب قبائل رومیوں کے زیرِ اثر تھے۔ روم

عربوں کے لیے ہرگز اجنبی ملک نہ تھا۔ سورۂ روم اس پر شاہد ہے۔ علاوہ بریں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قصّہ قرآن مجید میں از خود بیان نہیں فرمایا ہے بلکہ کفارِ مکّہ کے پوچھنے پر اس کا ذکر کیا ہے، اور کفارِ مکّہ کو اہلِ کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا امتحان لینے کے لیے ایسے واقعات دریافت کرنے کا مشورہ دیا تھا جن سے اہلِ عرب قطعی ناواقف تھے۔ (۴۷)

## قرآن کا بیان

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا ۝ إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى (الکہف آیات ۹ تا ۱۳)

ترجمہ: "کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے کہا کہ "اے پروردگار، ہم کو اپنی رحمتِ خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے۔ تو ہم نے انھیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سُلا دیا، پھر ہم نے انھیں اُٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدّتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے ـــــ ہم ان کا قصّہ تمھیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔"

وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَٰهًا ۖ لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا (الکہف آیت ۱۴)

ترجمہ: "ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیے جب وہ اُٹھے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے اگر ہم ایسا کریں گے تو بالکل بے جا بات کریں گے۔"

یعنی جب وہ سچے دل سے ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا اور ان کو یہ توفیق بخشی کہ حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں، اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لینا گوارا کر لیں مگر باطل کے آگے سر

نہ جھکائیں۔ (۴۸)

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ؕ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَی الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ○ (الکہف۔ آیات ۱۵-۱۶)

ترجمہ: "(پھر انھوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) یہ ہماری قوم تو ربّ کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جب تم ان سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمھارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمھارے کام کے لیے سروسامان مہیا کر دے گا۔"

جس زمانے میں ان خدا پرست نوجوانوں کو آبادیوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی تھی، اس وقت شہر افسس ایشیائے کوچک میں بُت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں ڈائنا دیوی کا ایک عظیم الشان مندر تھا جس کی شہرت تمام دُنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور دُور دُور سے لوگ اس کی پُوجا کے لیے آتے تھے۔ وہاں کے جادوگر، عامل، فال گیر اور تعویذ نویس دُنیا بھر میں مشہور تھے۔ شام و فلسطین اور مصر تک ان کا کاروبار چلتا تھا اور اس کاروبار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصا حصّہ تھا جو اپنے فن کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے (ملاحظہ ہو سائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر عنوان EPHESUS) شرک اور اوہام پرستی کے اس ماحول میں خدا پرستوں کا جو حال ہو رہا تھا اس کا اندازہ اصحاب کہف کے اس فقرے سے کیا جا سکتا ہے، کہ "اگر ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس ہمیں سنگسار ہی کر ڈالیں گے یا پھر زبردستی اپنی ملّت میں واپس لے جائیں گے۔" (۴۹)

اس قرارداد باہمی کے مطابق یہ لوگ شہر سے نکل کر پہاڑوں کے درمیان ایک غار میں جا چھپے تاکہ سنگسار ہونے یا مجبوراً مرتد ہونے سے بچ سکیں۔ (تفہیم القرآن جلد سوم الکہف حاشیہ ۱۲)

وَ تَرَی الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِیْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ

مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا ۝ (الکہف۔ آیت ۱۷)

ترجمہ: "تم انھیں غار میں دیکھتے تو تمھیں یوں نظر آتا کہ سُورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اُتر جاتا ہے اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے"۔

ان کے غار کا دہانہ شمال کے رُخ تھا جس کی وجہ سے سُورج کی روشنی کسی موسم میں بھی اندر نہ پہنچتی تھی اور باہر سے گزرنے والا یہ نہ دیکھ سکتا تھا کہ اندر کون ہے۔ (۵۰)

وَتَحْسَبُھُمْ اَیْقَاظًا وَّھُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُھُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَکَلْبُھُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْہِ بِالْوَصِیْدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَیْھِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْھُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْھُمْ رُعْبًا ۝ (الکہف۔ آیت ۱۸)

ترجمہ: "تم انھیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم انھیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے اور ان کا کُتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر انھیں دیکھتے تو اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر اُن کے نظارے سے دہشت بیٹھ جاتی"۔

یعنی اگر باہر سے کوئی جھانک کر دیکھتا بھی تو ان سات آدمیوں کے وقتاً فوقتاً کروٹیں لیتے رہنے کی وجہ سے وہ یہی گمان کرتا کہ یہ بس یونہی لیٹے ہوئے ہیں، سوئے ہوئے نہیں ہیں۔ (۵۱)

یعنی پہاڑوں کے اندر ایک اندھیرے غار میں چند آدمیوں کا اس طرح موجود ہونا اور آگے کُتے کا بیٹھے ہونا ایک ایسا دہشت ناک منظر پیش کرتا کہ جھانکنے والے ان کو ڈاکو سمجھ کر بھاگ جاتے تھے، اور یہ ایک بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کے حال پر اتنی مدّت تک پردہ پڑا رہا۔ کسی کو یہ جرأت ہی نہ ہوئی کہ اندر جا کر کبھی اصل معاملے سے باخبر ہوتا۔ (۵۲)

وَکَذٰلِکَ بَعَثْنٰھُمْ لِیَتَسَآءَلُوْا بَیْنَھُمْ ۔ (الکہف ۱۹)

ترجمہ: "اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انھیں اٹھا بٹھایا تاکہ آپس میں پُوچھ گچھ کریں"۔

یعنی جیسے عجیب طریقے سے وہ سلائے گئے تھے اور دُنیا کو ان کے حال سے بے خبر رکھا گیا تھا، ویسا

ہی عجیب کرشمۂ قدرت ان کا ایک طویل مدت کے بعد جاگنا بھی تھا۔ (۵۲)

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا۔ (الکہف۔ آیات ۱۹ تا ۲۱)

ترجمہ: "ان میں سے ایک نے پوچھا، کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟ دوسروں نے کہا "شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے" پھر وہ بولے "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ چلو اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں۔ اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے۔ اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے۔ یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے۔ اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔ اس طرح ہم نے اہلِ شہر کو ان کے حال پر مطلع کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بے شک آکر رہے گی۔"

یعنی جب وہ شخص کھانا خریدنے کے لیے شہر گیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ بت پرست روم کو عیسائی ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی۔ زبان، تہذیب، تمدن، لباس ہر چیز میں نمایاں فرق آگیا تھا۔ دو سو برس پہلے کا یہ آدمی اپنی سج دھج، لباس، زبان ہر چیز کے اعتبار سے فوراً ایک تماشا بن گیا۔ اور جب اس نے قیصر ڈیسیس کے وقت کا سکہ خریدنے کے لیے پیش کیا تو دکاندار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سُریانی روایت کی رُو سے دکاندار کو اس پر شبہ یہ ہوا کہ شاید یہ کسی پرانے زمانے کا دفینہ نکال کر لایا ہے چنانچہ اس نے آس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا اور آخر کار اس شخص کو حکام کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں جا کر یہ معاملہ کھلا کہ یہ شخص اُن پیروانِ مسیح میں سے ہے جو دو سو برس پہلے اپنا ایمان بچانے کے لیے بھاگ نکلے تھے۔ یہ خبر آناً فاناً شہر کی عیسائی آبادی میں

پھیل گئی اور حکام کے ساتھ لوگوں کا ایک ہجوم غار پر پہنچ گیا۔ اب جو اصحاب کہف خبردار ہوئے کہ دو سو برس بعد سو کر اُٹھے تو وہ اپنے عیسائی بھائیوں کو سلام کر کے لیٹ گئے اور ان کی روح پرواز کر گئی۔ (۵۴)

اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا (الکہف۔ آیت ۲۱)

ترجمہ: "(مگر خیال کرو کہ جب سوچنے کی اصل بات یہ تھی) اس وقت وہ آپس میں اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ ان (اصحاب کہف) کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا: "ان پر ایک دیوار چن دو"

سُریانی روایت کے مطابق اس زمانے میں وہاں قیامت اور عالمِ آخرت کے مسئلے پر زور شور کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اگرچہ رومی سلطنت کے اثر سے عام لوگ مسیحیت قبول کر چکے تھے، جس کے بنیادی عقائد میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل تھا، لیکن ابھی تک رومی شرک و بُت پرستی اور یونانی فلسفے کے اثرات کافی طاقتور تھے جن کی بدولت بہت سے لوگ آخرت سے انکار، یا کم از کم اس کے ہونے میں شک کرتے تھے۔ پھر اس شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی وہ یہ تھی کہ اِفسس میں یہودیوں کی بہت بڑی آبادی تھی اور ان میں سے ایک فرقہ (جسے صدوقی کہا جاتا تھا) آخرت کا کھلم کھلا منکر تھا۔ یہ گروہ کتاب اللہ (یعنی تورات) سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا اور مسیحی علماء کے پاس اس کے مقابلے میں مضبوط دلائل موجود نہ تھے۔ متی، مرقس، لوقا تینوں انجیلوں میں صدوقیوں اور مسیح علیہ السلام کے اس مناظرے کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو آخرت کے مسئلے پر ہوا تھا، مگر تینوں نے مسیح علیہ السلام کی طرف سے ایسا کمزور جواب نقل کیا ہے جس کی کمزوری کو خود علمائے مسیحیت بھی تسلیم کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو متی باب ۲۲۔ آیت ۲۳-۳۳۔ مرقس باب ۱۲۔ آیت ۱۸-۲۷۔ لوقا باب ۲۰۔ آیت ۲۷-۴۰) اسی وجہ سے منکرینِ آخرت کا پلہ بھاری ہو رہا تھا اور مومنین آخرت بھی شک و تذبذب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ عین اُس وقت اصحاب کہف کے بعث کا یہ واقعہ پیش آیا اور اس نے بعث بعد الموت کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت بہم پہنچا دیا۔ (۵۵)

رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ (الکہف۔ آیت ۲۱)

ترجمہ: "اُن کا رب ہی ان کے معاملے کو بہتر جانتا ہے"

فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صالحینِ نصاریٰ کا قول تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اصحاب کہف جس غار میں لیٹے ہوئے ہیں اسی طرح انھیں لیٹا رہنے دو اور غار کے دہانے کو تیغا لگا دو، ان کا رب ہی

بہتر جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کس مرتبے کے ہیں اور کس جزا کے مستحق ہیں۔ (۵۶)

قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا (الکہف۔ ۲۱)

ترجمہ: "مگر جو لوگ ان کے معاملات پر غالب تھے اُنھوں نے کہا" ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔"

اس سے مراد رومی سلطنت کے اربابِ اقتدار اور مسیحی کلیسا کے مذہبی پیشوا ہیں جن کے مقابلے میں صالح العقیدہ عیسائیوں کی بات نہ چلتی تھی۔ پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا، بزرگوں کے آستانے پوجے جا رہے تھے، اور مسیحؑ، مریم اور حواریوں کے مجسمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے بعث سے چند ہی سال پہلے ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دُنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی افسس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی جس میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور حضرت مریم کے "مادرِ خدا" ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروانِ مسیحؑ کے مقابلے میں اس وقت عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہ کار بنے ہوئے تھے اور مذہبی و سیاسی امور کی باگیں جن کے ہاتھوں میں تھیں یہی لوگ دراصل شرک کے علمبردار تھے اور انھوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔ (۵۷)

مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل اُلٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھیرا کر مقابرِ صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن اُنکی گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی، اسے انھوں نے ارتکابِ شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اس کی نہی میں موجود ہیں:

لعن اللّٰہ تعالٰی زائرات القبور و متخذین علیھا المساجد والسرج (احمد، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور

چراغ روشن کرنے والوں پر۔"

الا وان من کان قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیاءھم مساجد فانی انھٰکم عن ذٰلک (مسلم)

ترجمہ: "خبردار رہو، تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، میں تمھیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں"۔

لعن اللہ تعالیٰ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔"

ان اولٰٓئک اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علیٰ قبرہ مسجدا و صوروا فیہ تلک الصور اولٰٓئک شرار الخلق یوم القیامۃ (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

ترجمہ: "ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مرد صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے اور اس کی تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ قیامت کے روز بدترین مخلوقات ہوں گے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تصریحات کی موجودگی میں کون خدا ترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایۃً ذکر کیا گیا ہے اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل و حجت ٹھیرائے؟

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ ۱۸۳۴ء میں ریورینڈ ٹی ارنڈیل ARUNDELL نے "ایشیائے کوچک کے اکتشافات" DISCOVERIES IN ASIA MINOR کے نام سے اپنے جو مشاہدات شائع کیے تھے ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر افسس کے کھنڈرات سے متصل ایک پہاڑی پر اس نے حضرت مریمؑ اور "سات لڑکوں" (یعنی اصحاب کہف) کے مقبروں کے آثار پائے ہیں۔ (۵۸)

سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَۃٌ رَّابِعُھُمْ کَلْبُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ خَمْسَۃٌ سَادِسُھُمْ کَلْبُھُمْ رَجْمًا بِالْغَیْبِ وَیَقُوْلُوْنَ سَبْعَۃٌ وَّثَامِنُھُمْ کَلْبُھُمْ (الکہف-۲۲)

ترجمہ: کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے پونے تین سو سال بعد، نزولِ قرآن کے زمانے میں اس کی تفصیلات کے متعلق افسانے عیسائیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور عموماً مستند معلومات لوگوں کے پاس موجود نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پریس کا زمانہ نہ تھا کہ جن کتابوں میں اس کے متعلق نسبتاً زیادہ صحیح معلومات درج تھیں وہ عام طور پر شائع ہوتیں۔ واقعات زیادہ تر زبانی روایات کے ذریعے سے پھیلتے تھے، اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کی بہت سی تفصیلات افسانہ بنتی چلی جاتی تھیں۔ تاہم چونکہ تیسرے قول کی تردید
اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی ہے اس لیے یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ صحیح تعداد سات ہی تھی۔ (۵۹)

قُل رَّبِّیٓ أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا۔ (الکہف۔ آیت ۲۲)

ترجمہ: کہو، میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس تم سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو، اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔"

مطلب یہ ہے کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے بلکہ اصل چیز وہ سبق ہیں جو اس قصے سے ملتے ہیں اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک سچے مومن کو کسی حال میں حق سے منہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد اسبابِ دنیا پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے۔ اور حق پرستی کے لیے بظاہر ماحول میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہِ حق میں قدم اٹھا دینا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس "عادتِ جاریہ" کو لوگ "قانونِ فطرت" سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دنیا میں کچھ نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ درحقیقت اس کا پابند نہیں ہے، وہ جب اور جہاں چاہے اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ اس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو سو برس تک سلا کر اس طرح اٹھا بٹھائے جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی عمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی، غرض کسی چیز پر بھی اس امتدادِ زمانہ کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو

یک وقت زندہ کر کے اُٹھا دینا، جس کی خبر انبیاء اور کُتبِ آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان کس طرح ہر زمانے میں اللہ کی نشانیوں کو اپنے لیے سرمۂ چشمِ بصیرت بنانے کے بجائے اُلٹا مزید گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ اصحابِ کہف کا جو معجزہ اللہ نے اس لیے دکھایا تھا کہ لوگ اس سے آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اِسی نشان کو انھوں نے یہ سمجھا کہ اللہ نے انھیں اپنے کچھ اور ولی پُوجنے کے لیے عطا کر دیے —— یہ ہیں وہ سبق جو آدمی کو اس قصّے سے لینے چاہییں اور اس میں توجّہ کے قابل یہی امور ہیں۔ ان سے توجہ ہٹا کر اس کھوج میں لگ جانا کہ اصحابِ کہف کتنے تھے اور کتنے نہ تھے، اور ان کے نام کیا کیا تھے، اور اُن کا کتا کس رنگ کا تھا، یہ ان لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر صرف چھلکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے اہلِ ایمان کو یہ تعلیم دی کہ اگر دوسرے لوگ اس طرح کی غیر متعلق بحثیں چھیڑیں بھی تو تم اُن سے نہ اُلجھو، نہ ایسے سوالات کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرو، بلکہ اپنی توجہ صرف کام کی بات پر مرکوز رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی صحیح تعداد بیان نہیں فرمائی تاکہ شوقِ فضول رکھنے والوں کو غذا نہ ملے۔ (٦٠)

ابھی ہجرتِ حبشہ واقع نہ ہوئی تھی۔ اس وقت جو مسلمان ستائے جا رہے تھے اُن کو اصحابِ کہف کا قصّہ سنایا گیا تاکہ ان کی ہمّت بلند رہے اور انھیں معلوم ہو کہ اہلِ ایمان اپنا ایمان بچانے کے لیے اس سے پہلے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

اصحابِ کہف کے متعلق بتایا کہ وہ اُسی توحید کے قائل تھے جس کی دعوت یہ قرآن پیش کر رہا ہے، اور ان کا حال مکّے کے مُٹھی بھر مظلوم مسلمانوں کے حال سے اور ان کی قوم کا رویّہ کفارِ قریش کے رویّہ سے کچھ مختلف نہ تھا۔ پھر اسی قصّے سے اہلِ ایمان کو یہ سبق دیا گیا کہ اگر کفار کا غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مومن کو ظالم معاشرے میں سانس لینے تک کی مہلت نہ دی جا رہی ہو تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے۔ بلکہ اللہ کے بھروسے پر تن بتقدیر نکل جانا چاہیے۔ اِسی سلسلے میں ضمناً کفارِ مکہ کو یہ بھی بتایا کہ اصحابِ کہف کا قصّہ عقیدۂ آخرت کی صحت کا ایک ثبوت ہے۔ جس طرح خدا نے اصحابِ کہف کو ایک مدت دراز تک موت کی نیند سلانے کے بعد پھر جلا اُٹھایا اُسی طرح اس کی قدرت سے وہ بعث بعد الموت بھی کچھ بعید نہیں ہے جسے ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔ (٦١)

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ
(الکہف - آیت ۲۹)

ترجمہ: "صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے"۔

یہاں پہنچ کر صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ اصحاب کہف کا قصہ سنانے کے بعد یہ فقرے کس مناسبت سے ارشاد ہوئے ہیں۔ اصحاب کہف کے جو واقعات اُوپر بیان ہوئے ہیں ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ توحید پر ایمان لانے کے بعد اُنھوں نے کس طرح اُٹھ کر دو ٹوک بات کہہ دی کہ "ہمارا رب تو بس وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے"۔ اور پھر کس طرح وہ اپنی گمراہ قوم سے کسی قسم کی مصالحت پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ اُنھوں نے پورے عزم کے ساتھ کہا کہ "ہم اس کے سوا کسی دُوسرے اِلٰہ کو نہ پکاریں گے، اگر ہم ایسا کریں تو بڑی بے جا بات کریں گے اور کس طرح انھوں نے اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ کر بغیر کسی سہارے اور بغیر کسی سرو سامان کے ایک غار میں جا پڑنا قبول کر لیا، مگر یہ گوارا نہ کیا کہ حق سے بال برابر بھی ہٹ کر اپنی قوم سے مصالحت کر لیتے۔ پھر جب وہ بیدار ہوئے تب بھی انھیں فکر ہوئی تو اس بات کی کہ اگر خدانخواستہ ہماری قوم ہم کو اپنی ملت کی طرف پھیر لے جانے میں کامیاب ہوگئی تو ہم کبھی فلاح نہ پاسکیں گے۔ (۶۲)

فصل ۳

# یمن پر عیسائیت کا تسلّط اور واقعۂ فیل

## حبش کی عیسائی سلطنت کا یمن پر حملہ

نجران میں یمن کے یہودی فرمانروا ذونواس نے پیروانِ مسیح علیہ السلام پر جو ظلم کیا تھا اس کا بدلہ لینے کے لیے حبش کی عیسائی سلطنت نے یمن پر حملہ کر کے حِمیَری حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور ۵۲۵ء میں اس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ یہ ساری کارروائی دراصل قسطنطنیہ کی رومی سلطنت اور حبش کی حکومت کے باہم تعاون سے ہوئی تھی، کیونکہ حبشیوں کے پاس اس زمانے میں کوئی قابلِ ذکر بحری بیڑا نہ تھا۔ بیڑا رومیوں نے فراہم کیا اور حبش نے اپنی ۷۰ ہزار فوج اسی کے ذریعہ سے یمن کے ساحل پر اُتاری۔ آگے کے معاملات سمجھنے کے لیے یہ بات ابتدا ہی میں جان لینی چاہیے کہ یہ سب کچھ مذہبی جذبے سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے پیچھے معاشی و سیاسی اغراض بھی کام کر رہی تھیں، بلکہ غالباً وہی اس کی اصل محرک تھیں اور عیسائی مظلومین کے خون کا انتقام ایک بہانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ رومی سلطنت جب سے مصر و شام پر قابض ہوئی تھی۔ اسی وقت سے اس کی یہ کوشش تھی کہ مشرقی افریقہ، ہندوستان، انڈونیشیا وغیرہ ممالک اور رومی مقبوضات کے درمیان جس تجارت پر عرب صدیوں سے قابض چلے آرہے تھے، اسے عربوں کے قبضے سے نکال کر وہ خود اپنے قبضے میں لے لیں تاکہ اس کے منافع پورے کے پورے اسی کو حاصل ہوں اور عرب تاجروں کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے۔ اس مقصد کے لیے ۲۴ یا ۲۵ قبل مسیح میں قیصر اگسٹس نے ایک بڑی فوج رومی جنرل ایلیئس گالوس AELIUS GALLUS کی قیادت میں عرب کے مغربی ساحل پر اُتار دی تھی تاکہ وہ اس بحری راستے پر قابض ہو جائے جو جنوبی عرب سے شام کی طرف جاتا تھا۔ لیکن عرب کے شدید جغرافیائی حالات نے اس مہم کو ناکام کر دیا۔ اس کے بعد رومی اپنا جنگی بیڑہ بحرِ احمر میں لے آئے اور انھوں نے عربوں کی اُس تجارت کو ختم کر دیا جو وہ سمندر کے راستے کرتے تھے اور

صرف بری راستہ ان کے لیے باقی رہ گیا۔ اسی بری راستے کو قبضے میں لینے کے لیے انھوں نے حبش کی عیسائی حکومت سے گٹھ جوڑ کیا اور بحری بیڑے سے اُس کی مدد کر کے اُس کو یمن پر قابض کرا دیا۔

## اَبرہہ یمن کے اقتدار پر کیسے قابض ہُوا؟

یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی، اس کے متعلق عرب مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ وہ دو امیروں کی قیادت میں تھی، ایک اَریاط اور دُوسرا اَبْرَہہ۔ اور محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس فوج کا امیر اریاط تھا، اور اَبْرَہہ اس میں شامل تھا۔ پھر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اَبْرَہہ اور اریاط باہم لڑ پڑے، مقابلے میں اَریاط مارا گیا، اور اَبْرَہہ مُلک پر قابض ہو گیا اور پھر اُس نے شاہِ حبش کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اسی کو یمن پر اپنا نائب مقرر کر دے۔ اس کے برعکس یونانی اور سُریانی مؤرخین کا بیان ہے کہ فتحِ یمن کے بعد جب حبشیوں نے مزاحمت کرنے والے یمنی سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شُروع کر دیا تو ان میں سے ایک سردار اَلسُّمَیفع اَشْوَع (جسے یونانی مؤرخین ESYMPHAEUS لکھتے ہیں) نے حبشیوں کی اطاعت قبول کر کے اور جزیہ ادا کرنے کا عہد کر کے شاہِ حبش سے یمن کی گورنری کا پروانہ حاصل کر لیا۔ لیکن حبشی فوج نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، اور اَبْرَہہ کو اس کی جگہ گورنر بنا دیا۔ یہ شخص حبش کی بندرگاہ اَدُولیس کے ایک یونانی تاجر کا غلام تھا جو اپنی ہوشیاری سے یمن پر قبضہ کرنے والی حبشی فوج میں بڑا اثر و رُسوخ حاصل کر گیا تھا۔ شاہِ حبش نے اس کی سرکوبی کے لیے جو فوجیں بھیجیں وہ یا اس سے مل گئیں یا اُس نے ان کو شکست دے دی۔ آخر کار شاہِ حبش کے مرنے کے بعد اس کے جانشین نے اس کو یمن پر اپنا نائب السلطنت تسلیم کر لیا۔ (یونانی مؤرخین اس کا نام ابرامس ABRAMES اور سُریانی مؤرخین ابراہام ABRAHAM لکھتے ہیں۔ اَبْرَہہ غالباً اسی کا حبشی تلفظ ہے، کیونکہ عربی میں تو اس کا تلفظ ابراہیم ہے)

یہ شخص آہستہ آہستہ یمن کا خود مختار بادشاہ بن گیا، مگر برائے نام اس نے شاہِ حبش کی بالادستی تسلیم کر رکھی تھی اور اپنے آپ کو مفوّض الملک (نائب شاہ) لکھتا تھا۔ اس نے جو اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ۵۴۳ء میں وہ سدِّ مارِب کی مرمت سے فارغ ہوا تو اس نے ایک عظیم الشان جشن منایا، جس میں قیصرِ روم، شاہِ ایران، شاہِ حیرہ اور شاہِ غسان کے سفرا شریک ہوئے۔ اس کا مفصل تذکرہ اس کتبے میں درج ہے جو اَبْرَہہ نے سدِّ مارب پر لگایا تھا۔ یہ کتبہ آج بھی موجود ہے، اور

گلیزر GLASER نے اس کو نقل کیا ہے۔

## بلادِ عرب پر سیاسی، تجارتی اور مذہبی مہم

یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد اَبرَہہ نے اُس مقصد کے لیے کام شروع کر دیا جو اس مہم کی ابتدا سے رومی سلطنت اور اس کے حلیف حبشی عیسائیوں کے پیشِ نظر تھا، یعنی ایک طرف عرب میں عیسائیت پھیلانا اور دُوسری طرف اُس تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ یہ ضرورت اس بنا پر اور بڑھ گئی تھی کہ ایران کی ساسانی سلطنت کے ساتھ روم کی کشمکشِ اقتدار نے بلادِ مشرق سے رومی تجارت کے دوسرے تمام راستے بند کر دیے تھے۔

اَبرَہہ نے اس مقصد کے لیے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا جس کا ذکر عرب مؤرخین نے اَلقَلِیس یا اَلقُلَیس کے نام سے کیا ہے (یہ یونانی لفظ EKKLESIA کا معرَّب ہے اور اُردو کا لفظ کلیسا بھی اسی یونانی لفظ سے ماخوذ ہے)۔ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اُس نے شاہِ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا۔[۱] ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ اس نے یمن میں علی الاعلان اپنے اس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی منادی کرا دی۔ اس کی اس حرکت کا مقصد ہمارے نزدیک یہ تھا کہ عربوں کو غصّہ دلائے تاکہ وہ کوئی ایسی کارروائی کریں جس سے اس کو مکّہ پر حملہ کرنے اور کعبے کو منہدم کر دینے کا بہانہ مل جائے۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ اُس کے اس بیان پر غضبناک ہو کر ایک عرب نے کسی نہ کسی طرح کلیسا میں گھُس کر رفعِ حاجت کر ڈالی۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ فعل ایک قریشی نے کیا تھا۔ اور مقاتل بن سلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جا کر اس کلیسا میں آگ لگا دی تھی۔ ان میں سے کوئی واقعہ بھی اگر پیش آیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے۔ کیونکہ اَبرَہہ کا یہ اعلان یقیناً سخت اشتعال انگیز تھا اور قدیم جاہلیت کے دور میں اس پر کسی عرب یا قریشی کا، یا چند قریشی نوجوانوں کا مشتعل ہو کر کلیسا کو گندا کر دینا یا اس میں آگ لگا دینا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے، لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اَبرَہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے خفیہ طور پر ایسی کوئی حرکت کرائی ہو تاکہ اُسے مکّہ پر چڑھائی کا بہانہ مل

---

[۱] یمن پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کعبہ کے مقابلے میں ایک دوسرا کعبہ بنائیں اور عرب میں اس کی مرکزیت قائم کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے نجران میں بھی ایک کعبہ بنایا تھا۔

جائے اور اس طرح وہ قریش کو تباہ اور اہلِ عرب کو مرعوب کر کے اپنے دونوں مقصد حاصل کر لے ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، جب اَبْرَہہ کے پاس یہ رپورٹ پہنچی کہ کعبے کے معتقدین نے اس کے کلیسا کی یہ توہین کی ہے تو اس نے قسم کھائی کہ میں اُس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک کعبے کو ڈھا نہ دوں۔

## کعبہ پر اَبْرَہہ کی فوج کشی

اس کے بعد ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں ۶۰ ہزار فوج اور ۱۳ ہاتھی (اور بروایت بعض ۹ ہاتھی) لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا ۔ راستے میں پہلے یمن کے ایک سردار ذُونفر نے عربوں کا ایک لشکر جمع کر کے اس کی مزاحمت کی، مگر وہ شکست کھا کر گرفتار ہو گیا اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے بدرقے کی خدمت انجام دینا قبول کر لیا ۔ طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثقیف نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی طاقت کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے اور ان کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ ان کے معبود لات کا مندر بھی تباہ نہ کر دے ۔ چنانچہ اُن کا سردار مسعود ایک وفد لے کر اَبْرَہہ سے ملا اور اس نے کہا کہ ہمارا بتکدہ وہ معبد نہیں ہے جسے آپ ڈھانے آئے ہیں، وہ تو مکہ میں ہے، اس لیے آپ ہمارے معبد کو چھوڑ دیں، ہم مکہ کا راستہ بتانے کے لیے آپ کو بدرقہ فراہم کیے دیتے ہیں ۔ اَبْرَہہ نے یہ بات قبول کر لی اور بنی ثقیف نے ابورغال نامی ایک آدمی کو اس کے ساتھ کر دیا ۔ جب مکہ تین کوس رہ گیا تو المُغَمَّس (یا المُغَمِّس) نامی مقام پر پہنچ کر ابورغال مر گیا اور عرب مدتوں تک اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے ۔ بنی ثقیف کو بھی وہ سالہا سال تک طعنے دیتے رہے کہ انھوں نے لات کے مندر کو بچانے کے لیے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں سے تعاون کیا ۔

## اہلِ مکہ کا جوابی طرزِ عمل

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ المغمس سے اَبْرَہہ نے اپنے مقدمۃ الجیش کو آگے بڑھایا اور وہ اہلِ تہامہ اور قریش کے بہت سے مویشی لُوٹ لے گیا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ تھے ۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایلچی کو مکہ بھیجا اور اس کے ذریعہ سے اہلِ مکہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہوں ۔ اگر تم نہ لڑو تو میں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرض نہ کروں گا ۔ نیز اُس نے اپنے ایلچی کو ہدایت کی کہ اہلِ مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان کے سردار کو میرے پاس لے آنا ۔ مکے کے سب سے بڑے سردار اس وقت عبدالمطلب تھے ۔ ایلچی نے ان سے مل کر اَبْرَہہ کا پیغام پہنچایا ۔ انھوں نے کہا کہ ہم میں اَبْرَہہ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے، یہ اللہ کا گھر ہے،

وہ چاہے گا تو اپنے گھر کو بچالے گا۔ ایلچی نے کہا کہ آپ میرے ساتھ اَبْرَہہ کے پاس چلیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ اس قدر وجیہہ اور شاندار شخص تھے کہ ان کو دیکھ کر اَبْرَہہ بہت متاثر ہوا اور اپنے تخت سے اُتر کر اُن کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ میرے جو اُونٹ پکڑ لیے گئے ہیں وہ مجھے واپس دے دیے جائیں۔ اَبْرَہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متاثر ہوا تھا مگر آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اُونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دینِ آبائی کا مرجع ہے، اُس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انھوں نے کہا میں تو صرف اپنے اُونٹوں کا مالک ہوں اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر، تو اس کا مالک ایک رب ہے، وہ اس کی خود حفاظت کرے گا۔ اَبْرَہہ نے جواب دیا وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبدالمطّلب نے کہا۔ آپ جانیں اور وہ جانے۔ یہ کہہ کر وہ اَبْرَہہ کے پاس سے اُٹھ آئے اور اس نے ان کے اُونٹ واپس کر دیے۔

ابن عباسؓ کی روایت اس سے مختلف ہے۔ اس میں اونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عبد بن حُمَید، ابن المنذر، ابن مَرْدُوْیَہ، حاکم، ابو نُعیم اور بیہقی نے ان سے جو روایات نقل کی ہیں ان میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب اَبرَہہ الصِّفاح کے مقام پر پہنچا (جو عرفات اور طائف کے پہاڑوں کے درمیان حدودِ حرم کے قریب واقع ہے) تو عبدالمطّلب خود اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے، ہم خود لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اُس نے کہا میں نے سُنا ہے یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ عبدالمطّلب نے کہا یہ اللہ کا گھر ہے، آج تک اُس نے کسی کو اس پر مسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ اَبرَہہ نے جواب دیا ہم اسے منہدم کیے بغیر نہ پلٹیں گے۔ عبدالمطّلب نے کہا آپ جو کچھ ہم سے چاہیں لے لیں اور واپس چلے جائیں مگر اَبرَہہ نے انکار کر دیا اور عبدالمطّلب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

دونوں روایتوں کے اس اختلاف کو اگر ہم اپنی جگہ رہنے دیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں، تو ان میں سے جو صورت بھی پیش آئی ہو، بہر حال یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکّہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابلِ فہم بات ہے کہ قریش نے اس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ قریش کے لوگ تو جنگ احزاب کے موقع پر مشرک اور یہودی قبائل کو ساتھ ملا

کر زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار کی جمعیت فراہم کر سکے تھے، وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے؟

محمد بن اسحاق بیان کرتے تھے کہ ابرہہ کی لشکرگاہ سے واپس آکر عبد المطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قتلِ عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حرم میں داخل ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بُت موجود تھے۔ مگر یہ لوگ اس نازک گھڑی میں ان سب کو بھول گئے اور انھوں نے صرف اللہ کے آگے دستِ سوال پھیلایا۔ ان کی جو دُعائیں تاریخوں میں منقول ہوئی ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام نہیں پایا جاتا۔

ابنِ ہشام نے سیرت میں عبد المطلب کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

لاھُمّ ان العبد یمنع رحلہ فامنع حلالک

خدایا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما

لا یغلبنّ صلیبھم ومحالھم غدواً محالک

کل ان کی صلیب اور ان کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے

ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدالک

اگر تُو ان کو اور ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہے تو جو تُو چاہے کر

سُہیلی نے روض الاُنُف میں اس سلسلے کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

وانصر علیٰ آلِ الصلیب وعابدیہ الیوم آلک

صلیب کی آل اور اس کے پرستاروں کے مقابلے میں آج اپنی آل کی مدد فرما

ابنِ جریر نے عبد المطلب کے یہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اس موقع پر دُعا مانگتے ہوئے انھوں نے پڑھے تھے۔

یارب لا ارجو لھم سواکا یارب فامنع منھم حماکا

اے میرے رب تیرے سوا میں ان کے مقابلے میں کسی سے امید نہیں رکھتا۔ اے میرے رب ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر

انّ عدوّ البیت من عاداکا امنعھم ان یخربوا قراکا

اس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے۔ اپنی لبستی کو تباہ کرنے سے ان کو روک

## حفاظتِ کعبہ کے لیے خدائی انتظامات

یہ دُعائیں مانگ کر عبد المطلب اور ان کے ساتھی پہاڑوں میں چلے گئے۔

اور دُوسرے روز ابرہہ مکّے میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر اس کا خاص ہاتھی محمود، جو آگے آگے تھا، یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبر مارے گئے، آنکسوں سے کچوکے دیئے گئے، یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا، مگر وہ نہ ہلا۔ اسے جنوب، شمال اور مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا، مگر مکّے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے آئے اور انھوں نے اس لشکر پر ان سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا۔ محمد بن اسحاق اور عکرمہ کی روایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلادِ عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اسے سخت کُھجلی لاحق ہو جاتی اور کُھجاتے ہی جلد پھٹ جاتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابنِ عباسؓ کی دُوسری روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہُوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔ افراتفری میں ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ نُفَیل بن حبیب خَثْعَمی کو، جسے یہ لوگ بدرقہ بنا کر بلادِ خثعم سے پکڑ لائے تھے، تلاش کر کے انھوں نے کہا کہ واپسی کا راستہ بتائے مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

این المفر و الالٰہ الطالب و الاشرم المغلوب لیس الغالب

اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے جب کہ خدا تعاقب کر رہا ہے، اور نکٹا (ابرہہ) مغلوب ہے، غالب نہیں ہے

اس بھگدڑ میں جگہ جگہ یہ لوگ گر گر کر مرتے رہے۔ عطاء بن یسار کی روایت ہے کہ سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہو گئے، بلکہ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے۔ ابرہہ بھی بلادِ خثعم پہنچ کر مرا۔ [1]



---

[1] اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل کے بعد یمن میں ان کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی۔ جگہ جگہ یمنی سردار علمِ بغاوت لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ایک یمنی سردار سیف بن ذی یزن نے شاہِ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی اور ایران کی طرف سے ایک ہزار فوج جو چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی، حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہو گئی۔ یہ ۵۷۵ء کا واقعہ ہے۔

یہ واقعہ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان وادیٔ مُحَصَّب کے قریب مُحَسِّر کے مقام پر پیش آیا۔ صحیح مسلم اور ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حجۃ الوداع کا جو قصہ امام جعفر صادق نے اپنے والد ماجد امام محمد باقر سے اور انھوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے نقل کیا ہے اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جب مُزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے تو مُحَسِّر کی وادی میں آپؐ نے رفتار تیز کر دی۔ امام نووی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا۔ اسی لیے سُنّت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلدی گزر جائے۔ موطا میں امام مالک روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مُزدلفہ پورے کا پورا ٹھہرنے کا مقام ہے، مگر مُحَسِّر کی وادی میں نہ ٹھہرا جائے۔

## اس واقعہ کے متعلق ادباءِ عرب کی شہادتیں

نُفَیل بن حُبَیب کے جو اشعار ابنِ اسحاق نے نقل کیے ہیں ان میں وہ اس واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے:

ردینۃ لو رأیت ولا تریہ　　لدٰی جنب المحصب مارأینا

اے رُدینہ کاش تو دیکھتی، اور تو نہیں دیکھ سکے گی، جو کچھ ہم نے وادیٔ محصّب کے قریب دیکھا

حمدت اللہ اذ ابصرت طیرًا　　وخفت حجارۃ تلقی علینا

میں نے اللہ کا شکر کیا جب میں نے پرندوں کو دیکھا اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آپڑیں

وکل القوم یسأل عن نفیل　　کأن علیّ للحبشان دینا

ان لوگوں میں سے ہر ایک نُفَیل کو ڈھونڈ رہا تھا، گویا کہ میرے اُوپر حبشیوں کا کوئی قرض آتا تھا۔

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہو گئی اور اس پر بہت سے شعراء نے قصائد کہے۔ ان قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا اور کہیں اشارۃً و کنایۃً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں ان بتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پوجے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر عبد اللہ ابن الزِبَعْری کہتا ہے:

ستون الفالم یؤبوا ارضھم　　ولم یعش بعد الایاب سقیمھا

ساٹھ ہزار تھے جو اپنی سرزمین کی طرف واپس نہ جا سکے، اور نہ واپس ہونے کے بعد ان کا بیمار (ابرہہ) زندہ رہا۔

كانت بهاعاد وجرهم قبلهم　　والله من فوق العباد يقيمها

یہاں ان سے پہلے عاد اور جرہم تھے۔ اور اللہ بندوں کے اُوپر موجود ہے جو اسے قائم رکھے ہوئے ہے

ابوقیس بن اَسْلَت کہتا ہے:

فقوموا فصلوا ربکم وتمسحوا　　بارکان هٰذا البيت بين الاخاشب

اُٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور مکہ و منیٰ کی پہاڑیوں کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کو مسح کرو

فلما اتاکم نصر ذی العرش ردهم　　جنود المليك بين ساف وحاصب

جب عرش والے کی مدد تمہیں پہنچی تو اس بادشاہ کے لشکروں نے ان لوگوں کو اس حال میں پھیر دیا

کہ کوئی خاک میں پڑا تھا اور کوئی سنگسار کیا ہوا تھا۔

## واقعہ کے متعلق اہم روایات

یہی نہیں بلکہ حضرت اُمّ ہانیؓ اور حضرت زُبیر بن عوّامؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قریش نے ۱۰ سال اور بروایتِ بعض سات سال تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ اُمِّ ہانیؓ کی روایت امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں طَبَرانی، حاکم، ابن مُردویہ اور بیہقی نے اپنی کُتبِ حدیث میں نقل کی ہے۔ حضرت زبیرؓ کا بیان طبرانی اور ابن مرُدویہ اور ابنِ عساکر نے روایت کیا ہے اور اس کی تائید مزید حضرت سعید بن المسیّب کی اُس مُرسَل روایت سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کی ہے۔

## سرورِ عالم کی ولادتِ مبارکہ

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہلِ عرب اسے عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہتے ہیں، اور اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدّثین اور مؤرخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ محرّم میں پیش آیا تھا اور حضورؐ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپ کی ولادت واقعۂ فیل کے پچاس دن بعد ہوئی۔

## قرآن میں اس واقعہ کا اجمالی تذکرہ کس لیے؟

جو تاریخی تفصیلات اُوپر درج کی گئی ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سورہ میں اس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب الفیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا

ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے۔ واقعہ کچھ بہت پرانا نہ تھا۔ مکے کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ عرب کے لوگ عام طور پر اس سے واقف تھے۔ تمام اہل عرب اس بات کے قائل تھے کہ ابرہہ کے اس حملے سے کعبہ کی حفاظت کسی دیوی یا دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اللہ ہی سے قریش کے سرداروں نے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں اور چند سال تک قریش کے لوگ اس واقعہ سے اس قدر متاثر رہے تھے کہ انھوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورۂ فیل میں ان تفصیلات کے ذکر کی حاجت نہ تھی، بلکہ صرف اس واقعے کو یاد دلانا کافی تھا، تاکہ قریش کے لوگ خصوصاً، اور اہل عرب عموماً اپنے دلوں میں اس بات پر غور کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں وہ آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے، نیز وہ یہ بھی سوچ لیں کہ اگر اس دعوتِ حق کو دبانے کے لیے انھوں نے زور زبردستی سے کام لیا تو جس عذاب نے اصحاب الفیل کا تہس نہس کیا تھا اسی کے غضب میں وہ گرفتار ہوں گے۔ (۶۳)

# باب ۶

# بائبل میں نبی آخر الزماںؐ کی پیشین گوئیاں

فصل ا

# حضرت موسیٰؑ کی زبان سے بشارت

## قرآن کا اشارہ

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ۔ (الصف۔ آیت ۶)

ترجمہ:۔ "اور یاد کرو عیسیٰ ابنِ مریمؑ کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ اے بنی اسرائیل، میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

پہلے فقرے کو بعد والے فقرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد کے متعلق تورات کی دی ہوئی بشارت کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی ان کے آنے کی بشارت دیتا ہوں۔ اس معنی کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا اشارہ اُس بشارت کی طرف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے دی تھی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سُننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے مجمع کے دن اپنے خدا سے حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں

گا اور میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں اس کا حساب اُس سے لوں گا" (استثنا باب ۱۸۔ آیت ۱۵۔۱۹)



## تین اہم توضیحی اشارات

یہ تورات کی صریح پیشین گوئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔

اس میں حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو اللہ کا یہ ارشاد سنا رہے ہیں کہ میں تیرے لیے تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کے "بھائیوں" سے مراد خود اسی قوم کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کوئی دوسری ایسی قوم ہی ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اس کا قریبی نسلی رشتہ ہو۔ اگر مراد خود بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی آمد ہوتی تو الفاظ یہ ہوتے کہ میں تمہارے لیے خود تم ہی میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ لہٰذا بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد لامحالہ بنی اسماعیل ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی بنا پر ان کے نسبی رشتہ دار ہیں۔ مزید براں اس پیشین گوئی کا مصداق بنی اسرائیل کا کوئی نبی اس وجہ سے بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی ایک نبی نہیں، بہت سارے نبی آئے ہیں جن کے ذکر سے بائیبل بھری پڑی ہے۔

دوسری بات اس بشارت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو نبی برپا کیا جائے گا وہ حضرت موسیٰ کے مانند ہو گا۔ اس سے مراد ظاہر ہے کہ شکل صورت یا حالاتِ زندگی میں مشابہ ہونا تو نہیں ہے۔ کیونکہ اس لحاظ سے کوئی فرد بھی کسی دوسرے فرد کی مانند نہیں ہوا کرتا۔ اس سے مراد محض وصفِ نبوت میں مماثلت بھی نہیں ہے کیونکہ یہ وصف اُن تمام انبیاء میں مشترک ہے جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے ہیں۔ اس لیے کسی ایک نبی کی یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس وصف میں اُن کے مانند ہو۔ پس ان دونوں پہلوؤں سے مشابہت کے خارج از بحث ہو جانے کے بعد کوئی اور وجہ مماثلت، جس کی بنا پر آنے والے ایک نبی کی تخصیص قابل فہم ہو، اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے کے اعتبار سے حضرت موسیٰ کے مانند ہو۔ اور یہ خصوصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نبی بھی آئے تھے وہ شریعتِ موسوی کے پیرو تھے، اُن میں سے کوئی بھی ایک مستقل شریعت لے کر نہ آیا تھا۔

اس تعبیر کو مزید تقویت پیشین گوئی کے ان الفاظ سے ملتی ہے کہ "یہ تیری (یعنی بنی اسرائیل کی) اس

درخواست کے مطابق ہو گا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو اپنے خدا کی آواز سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تا کہ میں مر جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔" اس عبارت میں حورب سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلی مرتبہ احکام شریعت دیئے گئے تھے اور بنی اسرائیل کی جس درخواست کا اس میں ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ اگر کوئی شریعت ہم کو دی جائے تو اُن خوفناک حالات میں نہ دی جائے جو حورب پہاڑ کے دامن میں شریعت دیتے وقت پیدا کیے گئے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری یہ درخواست منظور کر لی ہے، اس کا ارشاد ہے کہ میں ان کے لیے ایک ایسا نبی برپا کروں گا جس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ یعنی آئندہ شریعت دیتے وقت وہ خوفناک حالات پیدا نہیں کیے جائیں گے جو حورب پہاڑ کے دامن میں پیدا کیے گئے تھے۔ بلکہ اب جو نبی اس منصب پر مامور کیا جائے گا، اس کے منہ میں بس اللہ کا کلام ڈال دیا جائے گا اور وہ اسے خلقِ خدا کو سنائے گا۔ اس تصریح پر غور کرنے کے بعد کیا اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اس کا مصداق کوئی اور نہیں ہے؟ حضرت موسیٰ کے بعد مستقل شریعت صرف آپ ہی کو دی گئی۔ اس کے عطا کرنے کے وقت کوئی ایسا مجمع نہیں ہوا جیسا حورب پہاڑ کے دامن میں بنی اسرائیل کا ہوا تھا اور کسی وقت بھی احکام شریعت دینے کے موقع پر وہ حالات نہیں پیدا کیے گئے جو وہاں پیدا کیے گئے تھے۔

فصل ۲

# حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے بشارت

حضرت عیسیٰ کے قول کا دوسرا حصّہ یہ ہے۔

وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ۔

ترجمہ: "اور میں بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہوگا"

یہ قرآن مجید کی ایک بڑی اہم آیت ہے جس پر مخالفینِ اسلام کی طرف سے بڑی لے دے بھی کی گئی ہے اور بدترین خیانتِ مجرمانہ سے بھی کام لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف نام لے کر آپؐ کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔

## وہ "احمد" ہوگا

۱۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی احمد بتایا گیا ہے۔ احمد کے دو معنی ہیں۔ ایک وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے وہ شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو، یا جو بندوں میں سے سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہو۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی حضورؐ کا ایک نام تھا۔ مسلم اور ابوداؤد طیالسی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ انا محمد وانا احمد والحاشر... "میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں حاشر ہوں ......" اسی مضمون کی روایات حضرت جبیرؓ بن مُطعم سے امام مالک، بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے نقل کی ہیں۔ حضور کا یہ اسمِ گرامی صحابہ میں معروف تھا، چنانچہ حضرت حسان بن ثابت کا شعر ہے۔

صلی الالٰہ ومن یحف بعرشہ    والطّیبون علی المبارک احمد

"اللہ نے اور اس کے عرش کے گرد جمگھٹا لگائے ہوئے فرشتوں نے اور سب پاکیزہ ہستیوں نے

بابرکت احمد پر درود بھیجا ہے۔"

تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ حضورؐ کا نام مبارک صرف محمدؐ ہی نہ تھا بلکہ احمد بھی تھا۔ عرب کا پورا لٹریچر اس بات سے خالی ہے کہ حضورؐ سے پہلے کسی کا نام احمد رکھا گیا ہو۔ اور حضورؐ کے بعد احمد اور غلام احمد اتنے لوگوں کا نام رکھے گئے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ زمانۂ نبوت سے لے کر آج تک تمام اُمّت میں یہ اسمِ گرامی معلوم و معروف رہا ہے۔ اگر حضور کا یہ اسمِ گرامی نہ ہوتا تو اپنے بچوں کے نام غلام احمد رکھنے والوں نے آخر کس احمد کا غلام ان کو قرار دیا تھا؟

## "وہ نبی" سے مراد کیا ہے؟

۲۔ انجیل یوحنا اس بات پر گواہ ہے کہ مسیح کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ایک مسیح، دوسرے ایلیاہ (یعنی حضرت الیاسؑ کی آمدِ ثانی) اور تیسرے "وہ نبی"۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

"اور یوحنا (حضرت یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ ...... اس نے کہا کہ میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو ....... انھوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟" (باب ۱۔ آیات ۱۹۔۲۵)

یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیحؑ اور حضرت الیاسؑ کے علاوہ ایک اور نبی کے بھی منتظر تھے، اور وہ حضرت یحییٰؑ نہ تھے۔ اس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل میں اس قدر مشہور و معروف تھا کہ "وہ نبی" کہہ دینا گویا اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بالکل کافی تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ "جس کی خبر تورات میں دی گئی ہے"۔ مزید براں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نبی کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے اس کا آنا قطعی طور پر ثابت تھا۔ کیونکہ جب حضرت یحییٰؑ سے یہ سوالات کیے گئے تو انھوں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے، تم کس نبی کے متعلق پوچھ رہے ہو۔

## انجیل یوحنا کی پیشین گوئیاں

۳۔ اب وہ پیشین گوئیاں دیکھیے جو انجیل یوحنا میں مسلسل باب ۱۴ سے ۱۶ تک منقول ہوئی ہیں:

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے یعنی رُوحِ حق جسے دُنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے۔ تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر ہے۔" (۱۴: ۱۶-۱۷)

"میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی رُوح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔" (۱۴: ۲۵-۲۶)

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" (۱۴: ۳۰)

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جسے میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کی رُوح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔" (۱۵: ۶)

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔" (۱۶: ۷)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے۔ مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا رُوح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لیے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمہیں خبریں دے گا۔" (۱۶: ۱۲-۱۵)

## انجیل ترجمہ در ترجمہ کے عمل سے گزری

۴۔ ان عبارتوں کے معنی متعین کرنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کے ہم عصر اہل فلسطین کی عام زبان آرامی زبان کی وہ بولی تھی جسے سُریانی SYRIAC کہا جاتا ہے۔ مسیح کی پیدائش سے دو ڈھائی سو برس پہلے ہی سلوقی SELEUCIDE اقتدار کے زمانے میں اس علاقے

سے عبرانی رخصت ہو چکی تھی اور سُریانی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اگرچہ سلوقی اور پھر رومی سلطنتوں کے اثر سے یونانی زبان بھی اس علاقے میں پہنچ گئی تھی، مگر وہ صرف اُس طبقے تک محدود رہی جو سرکار دربار میں رسائی پا کر، یا رسائی حاصل کرنے کی خاطر یونانیت زدہ ہو گیا تھا۔ فلسطین کے عام لوگ سریانی کی ایک خاص بولی DIALECT استعمال کرتے تھے جس کے لہجے اور تلفظات اور محاورات دمشق کے عام علاقے میں بولی جانے والی سُریانی سے مختلف تھے۔ اور اس ملک کے عوام یونانی سے اس قدر ناواقف تھے کہ جب ۷۰ئہ میں یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد رومی جنرل ٹیٹس TITUS نے اہلِ یروشلم کو یونانی میں خطاب کیا تو اس کا ترجمہ سُریانی زبان میں کرنا پڑا۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا تھا وہ لامحالہ سُریانی زبان ہی میں ہوگا۔

## انجیل کے مشتبہ نسخے اور ان میں ردّوبدل

دوسری بات یہ جاننی ضروری ہے کہ بائبل کی چاروں انجیلیں اُن یونانی بولنے والے عیسائیوں کی لکھی ہوئی ہیں جو حضرت عیسٰی کے بعد اس مذہب میں شامل ہوئے تھے۔ ان تک حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اقوال و اعمال کی تفصیلات سُریانی بولنے والے عیسائیوں کے ذریعہ سے کسی تحریر کی صورت میں نہیں بلکہ زبانی روایات کی شکل میں پہنچی تھیں اور ان سُریانی روایات کو انھوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے درج کیا تھا۔ ان میں سے کوئی انجیل بھی ۷۰ئہ سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ اور انجیل یوحنا تو حضرت عیسٰی کے ایک صدی بعد غالباً ایشیائے کوچک کے شہر افسس میں لکھی گئی ہے۔ مزید یہ کہ ان انجیلوں کا بھی کوئی اصل نسخہ اس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے جس میں ابتداءً یہ لکھی گئی ہے۔ مزید یہ کہ ان انجیلوں کے جتنے یونانی مسودات جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تین صدیوں کے دوران میں ان کے اندر کیا کچھ ردّوبدل ہوئے ہوں گے۔ اس معاملہ کو جو چیز خاص طور پر مشتبہ بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی انجیلوں میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ تغیر و تبدل کرنے کو بالکل جائز سمجھتے رہے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون بائبل کا مصنف لکھتا ہے:

"اناجیل میں ایسے نمایاں تغیرات دانستہ کیے گئے ہیں جیسے مثلاً بعض پوری پوری عبارتوں کو کسی دوسرے ماخذ سے لے کر کتاب میں شامل کر دینا ...... یہ تغیرات صریحاً کچھ ایسے لوگوں نے بالقصد کیے ہیں جنھیں اصل کتاب کے اندر شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا اور وہ

اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھتے رہے کہ کتاب کو بہتر یا زیادہ مفید بنانے کے لئے اس کے اندر اپنی طرف سے اس مواد کا اضافہ کردیں...... بہت سے اضافے دوسری صدی ہی میں ہو گئے تھے اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔"

اس صورتِ حال میں قطعی طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو اقوال ہمیں ملتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ٹھیک نقل ہوئے ہیں اور ان میں کوئی ردوبدل نہیں ہوا ہے۔

## ایک اور قابلِ توجہ پہلو

تیسری اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی تقریباً تین صدیوں تک فلسطین کے عیسائی باشندوں کی زبان سُریانی رہی اور کہیں نویں صدی عیسوی میں جا کر عربی زبان نے اس کی جگہ لی۔ ان سریانی بولنے والے اہلِ فلسطین کے ذریعہ سے عیسائی روایات کے متعلق جو معلومات ابتدائی تین صدیوں کے مسلمان علماء کو حاصل ہوئیں وہ ان لوگوں کی معلومات کی بہ نسبت زیادہ معتبر ہونی چاہئیں جنھیں سُریانی سے یونانی اور پھر یونانی سے لاطینی زبانوں میں ترجمہ در ترجمہ ہو کر یہ معلومات پہنچیں۔ کیونکہ مسیحؑ کی زبان سے نکلے ہوئے اصل سُریانی الفاظ اُن کے ہاں محفوظ رہنے کے زیادہ امکانات تھے۔

## یوحنا کی پیشین گوئیوں کا ماحصل

۵۔ ان ناقابلِ انکار تاریخی حقائق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ انجیل یوحنا کی مذکورہ بالا عبارات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دے رہے ہیں جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ "دُنیا کا سردار" (سرورِ عالم) ہوگا، ابد تک رہے گا، "سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا" اور خود ان کی (یعنی حضرت عیسیٰؑ کی) گواہی دے گا۔ یوحنا کی ان عبارتوں میں "روح القدس" اور "سچائی کی رُوح" وغیرہ الفاظ شامل کر کے مُدعا کو خبط کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان سب عبارتوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی ہے وہ کوئی روح نہیں بلکہ کوئی انسان اور خاص شخص ہے جس کی تعلیم عالمگیر، ہمہ گیر اور قیامت تک باقی رہنے والی ہوگی۔ اس شخص خاص کے لیے اردو ترجمے میں "مددگار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یوحنا کی اصل انجیل میں یونانی زبان کا جو لفظ استعمال کیا گیا تھا اس کے بارے میں عیسائیوں کو اصرار ہے کہ وہ PARACLETUS تھا مگر اُس کے معنی متعین کرنے میں خود عیسائی علماء کو سخت زحمت پیش آئی ہے۔ اصل یونانی زبان میں PARA CLETE کے کئی معنی ہیں۔ کسی جگہ کی طرف بلانا، مدد کے لیے پکارنا، انذار و تنبیہ،

ترغیب، اُکسانا، التجا کرنا، دعا مانگنا۔ پھر یہ لفظ اسی مفہوم میں یہ معنی دیتا ہے، تسلّی دینا، تسکین بخشنا، ہمت افزائی کرنا۔ بائیبل میں اس لفظ کو جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے ان سب مقامات پر اس کے کوئی معنی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اور اوریجن ORIGEN نے کہیں اس کا ترجمہ CONSOLATOR کیا ہے اور کہیں DEPRECATOR مگر دوسرے مفسرین نے ان دونوں ترجموں کو رد کر دیا کیونکہ اول تو یہ یونانی گرامر کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں دوسرے تمام عبارتوں میں جہاں یہ لفظ آیا ہے یہ معنی نہیں چلتے۔ بعض اور مترجمین نے اس کا ترجمہ TEACHER کیا ہے، مگر یونانی زبان کے استعمالات سے یہ معنی بھی اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ ترتولیان اور اگسٹائن نے لفظ ADVOCATE کو ترجیح دی ہے، اور بعض اور لوگوں نے ASSISTANT اور COMFORTER اور CONSOLER وغیرہ الفاظ اختیار کیے ہیں (ملاحظہ ہو سائیکلوپیڈیا آف بلیکل لٹریچر، لفظ پیرکلیٹس)

## ایک لفظ کا ہیر پھیر

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ یونانی زبان ہی میں ایک دوسرا لفظ PERICLYTOS موجود ہے جس کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا" یہ لفظ بالکل "محمدؐ" کا ہم معنی ہے۔ تلفظ میں اس کے اور PARACLĒTUS کے درمیان بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیا بعید ہے کہ جو مسیحی حضرات اپنی مذہبی کتابوں میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بے تکلف رد و بدل کر لینے کے خوگر رہے ہیں۔ انھوں نے یوحنا کی نقل کردہ پیشین گوئی کے اس لفظ کو اپنے عقیدہ کے خلاف پڑتا دیکھ کر اس کے املا میں یہ ذرا سا تغیر کر دیا ہو۔ اس کی پڑتال کرنے کے لیے یوحنا کی لکھی ہوئی ابتدائی یونانی انجیل بھی کہیں موجود نہیں ہے جس سے یہ تحقیق کیا جا سکے کہ وہاں ان دونوں الفاظ میں سے دراصل کون سا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

## اصل لفظ مُنحمنّا تھا

۶- لیکن فیصلہ اس پر بھی موقوف نہیں ہے کہ یوحنا نے یونانی زبان میں دراصل کون سا لفظ لکھا تھا، کیونکہ بہر حال وہ بھی ترجمہ ہی تھا اور حضرت مسیحؑ کی زبان اور پر ہم بیان کر چکے ہیں فلسطین کی سُریانی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہو گا وہ لامحالہ کوئی سریانی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ اصل لفظ ہمیں ابن ہشام کی سیرت میں مل جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اسی کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی یونانی لفظ کیا ہے۔ محمد بن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے یُحنّس (یوحنا) کی انجیل کے باب ۱۵، آیات ۲۳ تا ۲۷، اور باب ۱۶ آیت ۱ کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس میں یونانی "فارقلیط" کی

بجائے سریانی زبان کا لفظ منحمنا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ابن اسحاق اور ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ منحمنا کے معنی سُریانی زبان میں محمد اور یونانی میں برقلیطس ہیں۔"

(ابن ہشام جلد اول، ص ۲۴۸)

اب دیکھیے کہ تاریخی طور پر فلسطین کے عام عیسائی باشندوں کی زبان نویں صدی عیسوی تک سُریانی تھی۔ یہ علاقہ ساتویں صدی کے نصف اول سے اسلامی مقبوضات میں شامل تھا۔ ابنِ اسحاق نے ۱۵۲ھ میں اور ابنِ ہشام نے ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کے زمانے میں فلسطینی عیسائی سُریانی بولتے تھے۔ اور ان دونوں کے لیئے اپنے ملک کی عیسائی رعایا سے ربط پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ نیز اس زمانے میں یونانی بولنے والے عیسائی لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مقبوضات میں رہتے تھے۔ اس لیے یہ معلوم کرنا بھی ان کے لیے مشکل نہ تھا کہ سریانی کے کس لفظ کا ہم معنی یونانی زبان کا کون سا لفظ ہے۔ اب اگر ابن اسحاق کے نقل کردہ ترجمے میں سُریانی لفظ منحمنا استعمال ہوا ہے، اور ابنِ اسحاق یا ابنِ ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ عربی میں اس کا ہم معنی محمد اور یونانی میں برقلیطس ہے تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسیٰؑ نے حضورؐ کا نام مبارک لے کر آپ ہی کے آنے کی بشارت دی تھی اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یوحنا کی یونانی انجیل میں در اصل لفظ PERICLYTOS استعمال ہوا تھا جسے عیسائی حضرات نے بعد میں کسی وقت PARACLETUS سے بدل دیا ہے۔

## نجاشی کی تصدیق

"۔ اس سے بھی قدیم تر تاریخی شہادت حضرت عبداللہ بن مسعود کی یہ روایت ہے کہ مہاجرین حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بلایا، اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سُنیں تو اس نے کہا مَرْحَبًا بِكُمْ وَبِمَنْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِهٖ، أَشْهَدُ أَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَأَنَّهُ الَّذِي نَجِدُ فِي الْاِنْجِيْلِ وَأَنَّهُ الَّذِي بَشَّرَ بِهٖ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ۔ (مسند احمد)

یعنی "مرحبا تم کو اور اس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ ابن مریمؑ نے دی تھی۔" یہ قصہ احادیث میں خود حضرت جعفرؓ اور حضرت اُمِّ سلمہؓ سے بھی منقول ہوا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک نبی کی پیشین گوئی کر گئے ہیں، بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس نبی

کی ایسی صاف نشاندہی انجیل میں موجود تھی جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں۔ البتہ اس روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰ کی اس بشارت کے متعلق نجاشی کا ذریعہ معلومات یہی انجیل یوحنا تھی یا کوئی اور ذریعہ بھی اس کو جاننے کا اس وقت موجود تھا۔

## سب سے زیادہ قابلِ اعتماد نسخہ انجیل

۸۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بارے میں حضرت عیسیٰ کی پیشین گوئیوں کو نہیں، خود حضرت عیسیٰ کے اپنے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جن کو مسیحی کلیسا نے معتبر و مسلّم انجیل CANONICAL GOSPELS قرار دے رکھا ہے، بلکہ اس کا زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ وہ انجیل برناباس ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مشکوک الصحت APOCRYPHAL کہتا ہے۔ عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ صدیوں تک یہ دنیا سے ناپید رہی ہے۔ سولہویں صدی میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکسٹس SIXTUS کے کتب خانے میں پایا جاتا تھا اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا، پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرتا ہوا ۱۷۳۸ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ ۱۹۰۷ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس سے شائع ہو گیا تھا مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ کتاب تو اس مذہب کی جڑ ہی کاٹ دے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰ ؑ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے غائب کر دیے گئے اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ دوسرا ایک نسخہ اسی اطالوی ترجمے سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارہویں صدی میں پایا جاتا تھا، جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا اور آج اس کا بھی کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمے کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے اسے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے محض تعصب اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

مسیحی لٹریچر میں اس انجیل کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برناباس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اس بنا پر بول دیا گیا کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشینگوئیاں

ملتی ہیں۔ اول تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اگر کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوئی ہوتی اور علمائے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مقدمہ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک کا علم نہ تھا۔ طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابن حزم اور دوسرے مصنفین جو مسلمانوں میں مسیحی لٹریچر پر وسیع اطلاع رکھنے والے تھے ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برناباس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں ان کی بہترین فہرستیں ابن ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ہیں، اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برناباس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل اس بات کے جھوٹ ہونے کی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی ۷۵ سال پہلے پوپ گلاسیئس اول GELASIUS کے زمانے میں بدعقیدہ اور گمراہ کن HERETICAL کتابوں کی جو فہرست مرتب کی گئی تھی، اور ایک پاپائے فتوے کے ذریعہ سے جن کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا، ان میں انجیل برناباس EVANGELIOM BARNBE بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت کون سا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی تھی۔

# فصل ۳

# انجیل برناباس میں حضورؐ کے متعلق واضح تر پیشگوئیاں

## برناباس مسیحؑ کے اوّلین حواریوں میں سے تھا

بائبل میں جو چار انجیلیں قانونی اور معتبر قرار دے کر شامل کی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صحابی نہ تھا۔ اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ اس نے آنحضرتؐ کے صحابیوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں جن ذرائع سے ان لوگوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان کا کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ راوی نے آیا خود وہ واقعات دیکھے اور وہ اقوال سنے ہیں جنھیں وہ بیان کر رہا ہے یا ایک یا چند واسطوں سے یہ باتیں اُسے پہنچی ہیں۔ بخلاف اس کے برناباس کا مصنف کہتا ہے کہ میں مسیح کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں، شروع سے آخر تک مسیحؑ کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سُنے اقوال اس کتاب میں درج کر رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ دُنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت مسیحؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دنیا کے سامنے لانا تیری ذمہ داری ہے۔

## برناباس کی شخصیت

یہ برناباس کون تھا؟ بائبل کی کتاب اعمال میں بڑی کثرت سے اس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو قبرص کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا مسیحیت کی تبلیغ اور پیروانِ مسیح کی مدد و اعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ کب وہ دینِ مسیح میں داخل ہوا اور ابتدائی بارہ حواریوں کی جو فہرست تین انجیلوں میں دی گئی ہے اس میں بھی کہیں اس کا نام درج نہیں ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس انجیل کا مصنف وہی برناباس ہے یا کوئی اور۔ متی، اور مرقس نے حواریوں کی جو فہرست دی ہے، برناباس کی دی ہوئی فہرست اس سے صرف دو ناموں میں مختلف

APOSTLES

ہے۔ ایک توما، جس کے بجائے برناباس خود اپنا نام دے رہا ہے، دوسرا شمعون قنانی، جس کی جگہ وہ یہوداہ بن یعقوب کا نام لیتا ہے۔ لوقا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ بعد میں کسی وقت صرف برناباس کو حواریوں سے خارج کرنے کے لئے توما کا نام داخل کیا گیا ہے تاکہ اس کی انجیل سے پیچھا چھڑایا جا سکے، اور اس طرح کے تغیرات اپنی مذہبی کتابوں میں کر لینا ان حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔

## اناجیل اربعہ سے بہتر و برتر

اس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصب کے بغیر کھلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ان چاروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور اس طرح بیان ہوئے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقع وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ان واقعات میں خود شریک تھا۔ چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ واضح اور مفصل اور مؤثر طریقے سے بیان کی ہیں۔ توحید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفتِ باری تعالیٰ، عبادات کی روح اور اخلاق فاضلہ کے مضامین اس میں بڑے ہی پُر زور اور مدلل اور مفصل ہیں۔ جن سبق آموز تمثیلات کے پیرایہ میں مسیحؑ نے یہ مضامین بیان کیے ہیں ان کا عشر عشیر بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے بہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان، طرز بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ کوئی جعلی داستان نہیں ہے جو بعد میں کسی نے گھڑ لی ہو، بلکہ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام اناجیل اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصل شان میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس میں اُن تضادات کا نام و نشان بھی نہیں ہے جو اناجیل اربعہ میں اُن کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

## یہ انجیل نبوت عیسیٰؑ کی صحیح آئینہ دار ہے

اس انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور آپ کی تعلیمات ٹھیک ٹھیک ایک نبی کی زندگی اور تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ تمام پچھلے انبیا اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ صاف کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے سوا معرفتِ حق کا کوئی دوسرا ذریعہ

نہیں ہے اور جو انبیا کو چھوڑتا ہے وہ دراصل خدا کو چھوڑتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں جن کی تعلیم تمام انبیاء نے دی ہے۔ نماز، روزے اور زکوٰۃ کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی نمازوں کا جو ذکر بکثرت مقامات پر برناباس نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور تہجد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے، اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے۔ انبیاء میں سے وہ حضرت داؤد و سلیمان کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کو انبیا کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کو وہ ذبیح قرار دیتے ہیں اور ایک یہودی عالم سے اقرار کراتے ہیں کہ فی الواقع ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی تھے اور بنی اسرائیل نے زبردستی کھینچ تان کر کے حضرت اسحاقؑ کو ذبیح بنا رکھا ہے۔ آخرت اور قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

## انجیل برناباس سے عیسائیوں کی مخالفت کی وجہ

عیسائی جس وجہ سے انجیل برناباس کے مخالف ہیں، وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جگہ جگہ صاف اور واضح بشارتیں ہیں، کیونکہ وہ تو حضور کی پیدائش سے بھی بہت پہلے اس انجیل کو رد کر چکے تھے۔ اُن کی ناراضی کی اصل وجہ کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی تفصیلی بحث درکار ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے تھے، عقائد اور اخلاق اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسٰی کو مسیح تسلیم کر کے اُن پر ایمان لائے تھے اور وہ اُن کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہوا تو اُس نے رومیوں، یونانیوں اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی، اور اس غرض کے لیئے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسٰی علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسٰیؑ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی بلکہ اُن کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور اُن کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیرووں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اُس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اُس وقت بھی اُس نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا اور اس نئے دین کی تشکیل میں اُس کے پیش نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودی GENTILE دنیا قبول کرے۔ اُس نے اعلان

کردیا کہ ایک عیسائی شریعت یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام وحلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔ حتیٰ کہ اس نے مسیحؑ کی الوہیت اور اُن کے ابنِ خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولادِ آدم کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت مناسبت رکھتا تھا۔ مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے ان بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھہر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیحؑ کی الوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز (۳۲۵ء) میں نیقیہ NICAEA کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مسلّم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھہرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس ATHANASIUS کے ایک خط کے ذریعہ معتبر ومسلّم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء میں پوپ ڈیمیسیس DAMASIUS کے زیرِ صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس GELASIUS نے اس مجموعہ کو مسلّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جو غیر مسلّم تھیں، حالانکہ جن پولوسی عقائد کو بنیاد بنا کر مذہبی کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکا ہے کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔

## انجیل برناباس میں غلط عقائد کی تردید

انجیل برناباس اُن غیر مسلّم کتابوں میں اس لئے شامل کی گئی کہ وہ مسیحیت کے اس سرکاری عقیدے کے بالکل خلاف تھی۔ اس کا مصنف کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصدِ تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ ان لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جائے جو شیطان کے دھوکے میں آ کر یسوع کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں، ختنہ کو غیر ضروری

ٹھہراتے ہیں اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکہ کھانے والا پولوس بھی ہے۔" وہ بتاتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ دنیا میں موجود تھے اس زمانے میں ان کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے مشرک رومی سپاہیوں نے ان کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا، پھر یہ چھوت بنی اسرائیل کے عوام کو بھی لگ گئی۔ انہوں نے بار بار نہایت شدت کے ساتھ اپنے متعلق اس غلط عقیدے کی تردید کی اور اُن لوگوں پر لعنت بھیجی جو اُن کے متعلق ایسی باتیں کہتے تھے۔ پھر اُنھوں نے اپنے شاگردوں کو پورے یہودیہ میں اس عقیدے کی تردید کے لئے بھیجا اور اُن کی دُعا سے شاگردوں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صادر کرائے گئے جو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صادر ہوتے تھے، تاکہ لوگ اس غلط خیال سے باز آجائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صادر ہو رہے ہیں وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عیسیٰ کی مفصل تقریریں نقل کرتا ہے جن میں انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس غلط عقیدے کی تردید کی تھی، اور جگہ جگہ یہ بتاتا ہے کہ آنجناب اس گمراہی کے پھیلنے پر کس قدر پریشان تھے۔ مزید براں وہ اس پولوسی عقیدے کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے صلیب پر جان دی تھی۔ وہ اپنے چشم دید حالات یہ بیان کرتا ہے کہ جب یہوداہ اسکریوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجناب کو اُٹھا لے گئے، اور یہوداہ اسکریوتی کی شکل اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو حضرت عیسیٰؑ کی تھی۔ صلیب پر وہی چڑھایا گیا تھا نہ کہ حضرت عیسیٰ۔ اس طرح یہ انجیل پولوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی پوری توثیق کرتی ہے۔ حالانکہ نزولِ قرآن سے ۱۱۵ سال پہلے اُس کے اِن بیانات ہی کی بنا پر کلیسیا کے پادری اسے رد کر چکے تھے۔

## عیسائیوں کی بدقسمتی

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انجیل برناباس درحقیقت اناجیل اربعہ سے زیادہ معتبر انجیل ہے، اور مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اور سیرت اور اقوال کی صحیح ترجمانی کرتی ہے اور یہ عیسائیوں کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اس انجیل کے ذریعہ سے اپنے عقائد کی تصحیح اور حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جو موقع ان کو ملا تھا اسے محض ضد کی بنا پر انھوں نے کھو دیا۔ اس کے بعد ہم پورے اطمینان کے ساتھ وہ بشارتیں نقل کر سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں برناباس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے روایت کی ہیں۔ ان بشارتوں میں کہیں حضرت عیسیٰؑ حضورؐ کا نام لیتے ہیں۔ کہیں "رسول اللہ" کہتے ہیں، کہیں آپ کیلئے

"مسیح" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کہیں "قابلِ تعریف" ADMIRABLE کہتے ہیں اور کہیں صاف صاف ایسے فقرے ارشاد فرماتے ہیں جو بالکل لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے ہم معنی ہیں۔ ہمارے لیے ان ساری بشارتوں کو نقل کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ اتنی زیادہ ہیں، اور جگہ جگہ مختلف پیرایوں اور سیاق و سباق میں آئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔

## انجیل برناباس میں مندرج چند پیشگوئیاں

یہاں ہم محض بطور نمونہ ان میں سے چند کو نقل کرتے ہیں:۔

"تمام انبیاء جن کو خدا نے دنیا میں بھیجا، جن کی تعداد ایک لاکھ ۴۴ ہزار تھی، انھوں نے ابہام کے ساتھ بات کی۔ مگر میرے بعد تمام انبیاء اور مقدس ہستیوں کا نُور آئے گا جو انبیاء کی کہی ہوئی باتوں کے اندھیرے پر روشنی ڈال دے گا کیونکہ وہ خدا کا رسول ہے۔" (باب ۱۷)

"فریسیوں اور لاویوں نے کہا اگر تُو نہ مسیح ہے، نہ الیاس، نہ کوئی اور نبی، تو کیوں تو نئی تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسیح سے بھی زیادہ بنا کر پیش کرتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا جو معجزے خدا میرے ہاتھ سے دکھاتا ہے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں وہی کچھ کہتا ہوں جو خدا چاہتا ہے، ورنہ درحقیقت میں اپنے آپ کو اُس (مسیح) سے بڑا شمار کیے جانے کے قابل نہیں قرار دیتا جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ میں تو اُس خدا کے رسول کے موزے کے بند یا اس کی جوتی کے تسمے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں جس کو تم مسیح کہتے ہو، وہ مجھ سے پہلے بنایا گیا تھا اور میرے بعد آئے گا اور صداقت کی باتیں لے کر آئے گا تاکہ اس کے دین کی کوئی انتہا نہ ہو۔" (باب ۴۲)

"بالیقین میں تم سے کہتا ہوں کہ ہر نبی جو آیا ہے وہ صرف ایک قوم کے لیے خدا کی رحمت کا نشان بن کر پیدا ہوا ہے۔ اس وجہ سے اُن انبیاء کی باتیں ان لوگوں کے سوا کہیں اور نہیں پھیلیں جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ مگر خدا کا رسول جب آئے گا، خدا گویا اس کو اپنے ہاتھ کی مہر دے گا، یہاں تک کہ وہ دُنیا کی تمام قوموں کو جو اس کی تعلیم پائیں گے نجات اور رحمت پہنچا دے گا۔ وہ بے خدا لوگوں پر اقتدار لے کر آئے گا اور بُت پرستی کا ایسا قلع قمع کرے گا کہ شیطان پریشان ہو جائے گا۔" اس کے آگے شاگردوں کے ساتھ ایک طویل مکالمہ میں حضرت عیسیٰ تصریح کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل میں سے ہوگا۔ (باب ۴۳)

اُس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کا رسول وہ رونق ہے جس سے خدا کی پیدا کی ہوئی قریب قریب تمام چیزوں کو خوشی نصیب ہوگی کیونکہ وہ فہم اور نصیحت، حکمت اور طاقت، خشیت اور محبت، حزم اور ورع کی رُوح سے مزیّن ہے جو اس نے خدا سے اُن تمام چیزوں کی بہ نسبت تین گنی پائی ہے جنھیں خدا نے اپنی مخلوق میں سے یہ رُوح بخشی ہے۔ کیسا مبارک وقت ہوگا جب وہ دنیا میں آئے گا۔ یقین جانو، میں نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے جس طرح ہر نبی نے اس کو دیکھا ہے۔ اس کی رُوح کو دیکھنے ہی سے خدا نے ان کو نبوّت دی۔ اور جب میں نے اس کو دیکھا تو میری رُوح سکینت سے بھر گئی یہ کہتے ہوئے کہ اے محمدؐ، خدا تمھارے ساتھ ہو، اور وہ مجھے تمہاری جوتی کے تسمے باندھنے کے قابل بنادے کیونکہ یہ مرتبہ بھی پالوں تو میں ایک بڑا نبی اور خدا کی ایک مقدس ہستی ہو جاؤں گا"۔ (باب - ۴۴)

"(میرے جانے سے) تمہارا دل پریشان نہ ہو، نہ تم خوف کرو، کیونکہ میں نے تم کو پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ خدا ہمارا خالق، جس نے تمھیں پیدا کیا ہے، وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔ رہا میں تو اس وقت میں دنیا میں اُس رسولِ خدا کے لیے راستہ تیار کرنے آیا ہوں جو دنیا کے لیے نجات لے کر آئے گا....... اندریاس نے کہا، اُستاد ہمیں اس کی نشانی بتادے تاکہ ہم اسے پہچان لیں۔ یسوع نے جواب دیا، وہ تمھارے زمانے میں نہیں آئے گا بلکہ تمھارے کچھ سال بعد آئے گا جبکہ میری انجیل ایسی مسخ ہو چکی ہوگی کہ مشکل سے کوئی ۳۰ آدمی مومن باقی رہ جائیں گے۔ اُس وقت اللّٰہ دُنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا جس کے سر پر سفید بادل کا سایہ ہوگا جس سے وہ خدا کا برگزیدہ جانا جائے گا اور اس کے ذریعہ سے خدا کی معرفت دنیا کو حاصل ہوگی۔ وہ بے خدا لوگوں کے خلاف بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا اور زمین پر بُت پرستی کو مٹادے گا۔ اور مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے ہمارا خدا پہچانا جائے گا اور اس کی تقدیس ہوگی اور میری صداقت دنیا کو معلوم ہوگی اور وہ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو مجھے انسان سے بڑھ کر کچھ قرار دیں گے........ وہ ایک ایسی صداقت کے ساتھ آئے گا جو تمام انبیاء کی لائی ہوئی صداقت سے زیادہ واضح ہوگی"۔

(باب - ۷۲)

"خدا کا عہد یروشلم میں، معبدِ سلیمان کے اندر تعمیر کیا گیا تھا نہ کہ کہیں اور۔ مگر میری بات کا یقین کرو کہ

ایک وقت آئے گا جب خدا اپنی رحمت ایک اور شہر میں نازل فرمائے گا، پھر ہر جگہ اُس کی صحیح عبادت ہو سکے گی، اور اللہ اپنی رحمت سے ہر جگہ سچی نماز کو قبول فرمائے گا۔۔۔۔۔۔۔ میں دراصل اسرائیل کے گھرانے کی طرف نجات کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، مگر میرے بعد مسیح آئے گا، خدا کا بھیجا ہوا تمام دنیا کی طرف، جس کے لیے خدا نے یہ ساری دنیا بنائی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں اللہ کی عبادت ہوگی، اور اس کی رحمت نازل ہوگی۔" (باب - ۸۳)

("یسوع نے سردار کاہن سے کہا) زندہ خدا کی قسم جس کے حضور میری جان حاضر ہے، میں وہ مسیح نہیں ہوں جس کی آمد کا تمام دنیا کی قومیں انتظار کر رہی ہیں، جس کا وعدہ خدا نے ہمارے باپ ابراہیم سے یہ کہہ کر کیا تھا کہ "تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی" (پیدائش ۲۲: ۱۸)۔ مگر جب خدا مجھے دُنیا سے لے جائے گا تو شیطان پھر یہ بغاوت برپا کرے گا کہ ناپرہیزگار لوگ مجھے خدا اور خدا کا بیٹا مانیں۔ اُس کی وجہ سے میری باتوں اور میری تعلیمات کو مسخ کر دیا جائے گا یہاں تک کہ بمشکل ۳۰ صاحب ایمان باقی رہ جائیں گے۔ اس وقت خدا دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنا رسول بھیجے گا جس کے لیے اس نے دنیا کی یہ ساری چیزیں بنائی ہیں، جو قوت کے ساتھ جنوب سے آئے گا اور بتوں کو بت پرستوں کے ساتھ برباد کر دے گا، جو شیطان سے وہ اقتدار چھین لے گا جو اس نے انسانوں پر حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کی رحمت اُن لوگوں کی نجات کے لیے اپنے ساتھ لائے گا جو اس پر ایمان لائیں گے، اور مبارک ہے وہ جو اس کی باتوں کو مانے۔" (باب - ۹۶)

"سردار کاہن نے پوچھا کیا خدا کے اس رسول کے بعد دوسرے نبی بھی آئیں گے؟ یسوع نے جواب دیا اس کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے سچے نبی نہیں آئیں گے مگر بہت سے جھوٹے نبی آجائیں گے جن کا مجھے بڑا غم ہے۔ کیونکہ شیطان خدا کے عادلانہ فیصلے کی وجہ سے ان کو اٹھائے گا اور وہ میری انجیل کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائیں گے۔" (باب - ۹۷)

"سردار کاہن نے پوچھا کہ وہ مسیح کس نام سے پکارا جائے گا اور کیا نشانیاں اس کی آمد کو ظاہر کریں گی؟ یسوع نے جواب دیا اس مسیح کا نام "قابلِ تعریف" ہے، کیونکہ خدا نے جب اس کی روح پیدا کی تھی اُس وقت اس کا یہ نام خود رکھا تھا اور وہاں اسے ایک ملکوتی شان میں رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا "اے محمدؐ، انتظار کر، کیونکہ تیری ہی خاطر میں جنت، دُنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کروں گا اور

اُس کو تجھے تحفہ کے طور پر دوں گا، یہاں تک کہ جو تیری تبریک کرے گا اسے برکت دی جائے گی اور جو تجھ پر لعنت کرے گا اُس پر لعنت کی جائے گی۔ جب میں تجھے دنیا کی طرف بھیجوں گا تو میں تجھ کو اپنے پیغامبرِ نجات کی حیثیت سے بھیجوں گا۔ تیری بات سچی ہوگی یہاں تک کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے مگر تیرا دین نہیں مٹے گا۔" سو اُس کا مبارک نام محمد ہے۔" (باب ۔۹۷)

برناباس لکھتا ہے کہ ایک موقع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسیٰؑ نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو بعد میں یہوداہ اسکریوتی نکلا) مجھے ۳۰ سکوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے گا، پھر فرمایا:۔

"اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا، کیونکہ خدا مجھے زمین سے اوپر اٹھالے گا اور اس غدار کی صورت ایسی بدل دے گا کہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ میں ہی ہوں۔ تاہم جب وہ ایک بری موت مرے گا تو ایک مدت تک میری ہی تذلیل ہوتی رہے گی مگر جب محمد خدا کا مقدس رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دور کر دی جائے گی۔ اور خدا یہ اس لیے کرے گا کہ میں نے اُس مسیح کی صداقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مجھے اس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ میں زندہ ہوں اور اُس ذلت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔" (باب ۔۱۱۳)

"شاگردوں سے حضرت عیسیٰؑ نے کہا! بے شک میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر موسیٰؑ کی کتاب سے صداقت مسخ نہ کر دی گئی ہوتی تو خدا ہمارے باپ داؤدؑ کو ایک دوسری کتاب نہ دیتا؛ اور اگر داؤدؑ کی کتاب میں تحریف نہ کی گئی ہوتی تو خدا مجھے انجیل نہ دیتا، کیونکہ خداوند ہمارا خدا بدلنے والا نہیں ہے اور اُس نے سب انسانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے۔ لہذا جب اللہ کا رسول آئے گا تو وہ اس لیے آئے گا کہ ان ساری چیزوں کو صاف کر دے جن سے بے خدا لوگوں نے میری کتاب کو آلودہ کر دیا ہے۔" (باب ۱۲۴)

## تین شبہات اور ان کا جواب

ان صاف اور مفصل پیشین گوئیوں میں صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو بادی النظر میں نگاہ کو کھٹکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں، اور انجیل برناباس کی متعدد دوسری عبارتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مسیح ہونے کا انکار کیا ہے۔ دوسری یہ کہ صرف انہی عبارتوں میں نہیں بلکہ اس انجیل کے بہت سے مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل عربی نام "محمد" لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ انبیاء کی پیشین گوئیوں کا عام طریقہ نہیں ہے کہ بعد میں آنے والی کسی ہستی کا اصل نام لیا جائے۔ تیسری یہ کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسیح کہا گیا ہے:۔

پہلے شبے کا جواب یہ ہے کہ صرف انجیل برناباس ہی میں نہیں بلکہ لوقا کی انجیل میں بھی یہ ذکر موجود ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے شاگردوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ وہ آپ کو مسیح کہیں۔ لوقا کے الفاظ یہ ہیں: "اس نے ان سے کہا لیکن تم مجھے کیا کہتے ہو؟ پطرس نے جواب میں کہا "خدا کا مسیح"۔ اس نے ان کو تاکید کر کے حکم دیا کہ یہ کسی سے نہ کہنا۔" (۹: ۲۰-۲۱) غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جس مسیح کے منتظر تھے اس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ تلوار کے زور سے دشمنانِ حق کو مغلوب کرے گا، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ مسیح میں نہیں ہوں بلکہ وہ میرے بعد آنے والا ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ برناباس کا جو اطالوی ترجمہ اس وقت دنیا میں موجود ہے اس کے اندر تو حضورؐ کا نام بے شک محمد لکھا ہوا ہے، مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کتاب کن کن زبانوں سے ترجمہ در ترجمہ ہوتی ہوئی اطالوی زبان میں پہنچی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل انجیل برناباس سریانی زبان میں ہوگی، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی زبان تھی۔ اگر وہ اصل کتاب دستیاب ہوتی تو دیکھا جا سکتا تھا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی کیا لکھا گیا تھا۔ اب جو کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل میں تو حضرت عیسیٰؑ نے لفظ مُنحمنا استعمال کیا ہوگا، جیسا کہ ہم ابنِ اسحاق کے دیے ہوئے انجیل یوحنا کے حوالہ سے بتا چکے ہیں، پھر مختلف مترجموں نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے کر دیے ہوں گے۔ اس کے بعد غالباً کسی مترجم نے یہ دیکھ کر کہ پیشین گوئی میں آنے والے کا جو نام بتایا گیا ہے وہ بالکل لفظ "محمدؐ" کا ہم معنی ہے، آپ کا یہی اسم گرامی لکھ دیا ہوگا۔ اس لیے صرف اسم کی تصریح یہ شبہ پیدا کر دینے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ پوری انجیل برناباس کسی مسلمان نے جعلی تصنیف کر دی ہے۔

تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ لفظ "مسیح" درحقیقت ایک اسرائیلی اصطلاح ہے جسے قرآن مجید میں مخصوص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے لیے صرف اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ یہودی ان کے مسیح ہونے کا انکار کرتے تھے ورنہ یہ نہ قرآن کی اصطلاح ہے نہ قرآن میں کہیں اس کو اسرائیلی اصطلاح کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے کہ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لفظ مسیح استعمال کیا ہو اور قرآن میں آپ کے لیے یہ لفظ استعمال نہ کیا گیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ انجیل برناباس آپ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرتی ہے جس سے قرآن انکار کرتا ہے۔ دراصل بنی اسرائیل کے ہاں قدیم طریقہ یہ تھا کہ کسی چیز یا کسی شخص کو جب کسی مقدس مقصد کے لیے مختص کیا جاتا تھا تو اس چیز پر یا اس شخص کے سر پر تیل مل کر اسے متبرک کر دیا جاتا تھا CONSECRATE عبرانی زبان میں تیل ملنے کے اس فعل کو مسیح کہتے تھے اور جس پر ملا جاتا تھا

اسے مسح کہا جاتا تھا۔ عبادت گاہ کے ظروف اسی طریقہ سے مسح کر کے عبادت کے لیے وقف کیے جاتے تھے۔ کاہنوں کو کہانت PRIESTHOOD کے منصب پر مامور کرتے وقت بھی مسح کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور نبی بھی جب خدا کی طرف سے بادشاہت یا نبوت کے لیے نامزد کیے جاتے تو انہیں مسح کیا جاتا۔ چنانچہ بائیبل کی رُو سے بنی اسرائیل کی تاریخ میں بکثرت مسیح پائے جاتے ہیں۔ حضرت ہارون کاہن کی حیثیت سے مسیح تھے، حضرت موسیٰؑ کاہن اور نبی کی حیثیت سے، طالوت بادشاہ کی حیثیت سے، حضرت داؤد بادشاہ اور نبی کی حیثیت سے، مَلِکِ صِدق بادشاہ اور کاہن کی حیثیت سے، اور حضرت اَلْیَسَعؑ نبی کی حیثیت سے مسیح تھے۔ بعد میں یہ بھی ضروری نہ رہا تھا کہ تیل مل کر ہی کسی کو مامور کیا جائے، بلکہ محض کسی کا مامور من اللہ ہونا ہی مسیح ہونے کا ہم معنی بن گیا تھا۔ مثال کے طور پر دیکھیے ۱۔ سلاطین، باب ۱۹ میں ذکر آیا ہے کہ خدا نے حضرت الیاس (ایلیاہ) کو حکم دیا کہ حزائیل کو مسح کر کے آرام (دمشق) کا بادشاہ ہو، اور نمسی کے بیٹے یاہو کو مسح کر کہ اسرائیل کا بادشاہ ہو اور الیشع (اَلْیَسَعؑ) کو مسح کر کہ تیری جگہ نبی ہو۔ ان میں سے کسی کے سر پر بھی تیل نہیں ملا گیا۔ بس خدا کی طرف سے ان کی ماموریت کا فیصلہ سُنا دینا گویا انہیں مسح کر دینا تھا۔ پس اسرائیلی تصور کے مطابق لفظ مسیح درحقیقت "مامور من اللہ" کا ہم معنی تھا اور اسی معنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا تھا۔ (لفظ "مسیح" کے اسرائیلی مفہوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سائیکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، لفظ "میسیاہ")

# باب

# عیسائی خاتم النّبیّین کے دَور میں

فصل ۱

# چند اہم واقعات

"تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تران لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدُّنیا فقیر پائے جاتے تھے اور ان میں غرور نفس نہیں ہے۔"

## وَرقہ بن نوفل کی تصدیق نبوّت

(غارِ حرا میں فرشتے سے پہلی ملاقات کے بعد جب حضورؐ لرزتے اور کانپتے گھر پہنچے تو پہلے حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسکین دی) پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے، زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا۔ "بھائی جان! ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنیئے۔" ورقہ نے حضورؐ سے کہا۔ "بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔ وَرقہ نے کہا۔ "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ کاش کہ میں آپ کے زمانہ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" ورقہ نے کہا۔ "ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپؐ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ وَرقہ کا انتقال ہو گیا ......

وَرقہ بن نوفل مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آرہے تھے اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی جب یہ واقعہ سُنا تو اسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوا تھا۔ اس

کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔

## عیسائی سلطنت میں مسلمانوں کی ہجرت

(مکہ میں) حالات جب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ عام الفیل (۵ نبوی) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ

"لو خرجتم الی الارض الحبشة فان بها ملکا لا یظلم عنده احد و هی ارض صدق حتی یجعل اللہ لکم فرجا مما انتم فیه۔"

"اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔"[1]



اس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا، مگر خوش قسمتی سے شُعَیبہ کے بندرگاہ پر اُن کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ رہے۔ پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی یہاں تک کہ ۸۳ مرد اور گیارہ عورتیں اور ۷ غیر قریشی مسلمان حبش میں جمع ہو گئے اور مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۴۰ آدمی رہ گئے۔

## حبش کے عیسائی بادشاہ کی حق پسندی

(سیرتِ سرورِ عالم میں "ہجرتِ حبشہ" کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے) یہاں صرف یہ بیان کرنا مطلوب ہے کہ مسلمان مہاجرین کے خلاف جب ان کے تعاقب میں آنے والے مشرکینِ مکہ کی سفارت نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور دعوت پر انہوں نے اعتراض اُٹھائے تو عیسائی بادشاہ نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے حضورؐ پر نازل شدہ کلام کا کوئی حصہ سنانے کی فرمائش کی۔

حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورہ مریم کا وہ ابتدائی حصہ سنایا جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق

---

[1] حبش کی عیسائی سلطنت کے متعلق آنحضرتؐ نے وسیع الظرفی اور کشادہ دلی سے کلمات تحسین کہے ہیں اور وہاں کے حکمران کی انصاف پسندی کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو حبشہ میں ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ یہی ایک واقعہ اس بات کو کافی تھا کہ عیسائیوں سے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ بہترین صورت میں استوار ہوتے۔ مگر افسوس کہ ان لوگوں نے محض تعصبات کی دیواریں کھڑی کر لیں۔ (مرتبین)

ہے۔ نجاشی اس کو سُنتا رہا اور روتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی۔ حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اُس نے کہا کہ یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں۔

لیکن اس سفارت نے حبش کے درباری مذہبی پیشواؤں کو رشوتیں دے دلا کر اپنے ساتھ ملایا اور اگلے دن دربار میں عمرو بن العاص نے یہ سوال اٹھایا کہ "ذرا ان لوگوں کو بُلا کر یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے؟"

نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا........ اور عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال اُن کے سامنے دُہرایا تو جعفر بن ابی طالب نے اُٹھ کر بلا تامل کہا کہ "ھو عبد اللہ و رسولہ و روحہ و کلمۃ اللہ القاھا الی مریم العذراء البتول"

نجاشی نے یہ سُن کر ایک تنکا زمین سے اٹھایا اور کہا "خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے، عیسیٰؑ اُس سے اِس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے۔"

## حبش کے لیے مسلمانوں کا خاص رویّہ

ابو داؤد اور مسند امام احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ملتا ہے جس میں حبش کے متعلق آپ نے یہ پالیسی متعین فرمادی تھی کہ دعوا الحبشۃ ما دعوکم دوسری روایت کے الفاظ ہیں اترکوا الحبشۃ ما ترکوکم یعنی "حبش کے لوگ جب تک تمہیں چھوڑے رکھیں تم بھی انھیں چھوڑے رکھو۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خلفاء راشدین کے دور میں حبش کی طرف کوئی اقدام نہیں کیا گیا اس ارشاد میں جو مصلحت تھی، ممکن ہے کہ اس میں کسی حد تک اس بات کا لحاظ بھی ہو کہ اہلِ حبش نے مسلمانوں کو اُن کی مصیبت کے وقت جو پناہ دی تھی اس کی رعایت کی جائے اور اپنی طرف سے ان کے خلاف پہل نہ کی جائے تاکہ دنیا کو کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہو سکے کہ مسلمان ایک احسان فراموش جماعت ہیں لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ حبش کی جغرافی پوزیشن، اور اس کی سابق تاریخ کو دیکھتے ہوئے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرمایا ہو گا کہ اسلام کے جغرافی مرکز، یعنی حجاز کے تحفظ کے لیے حبش سے تعلقات کا درست رہنا ضروری ہے۔ اسی مصلحت سے آپ نے یہ ہدایت فرمائی ہو گی کہ جہاں تک اسلام کی دعوت کا تعلق ہے وہ پُر امن طریقے سے اس ملک میں پھیلائی جاتی رہے، لیکن جنگ سے حتی الامکان پرہیز کیا جائے۔

## مُقوقس مصر کا رقیہ

صُلح حدیبیہ سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط اطراف و نواح کے بادشاہوں کو بھیجے تھے ان میں سے ایک اسکندریہ کے رومی بطریق PATRIARCH کے نام بھی تھا جسے عرب مُقوقس کہتے تھے۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ یہ نامۂ گرامی لے کر جب اس کے پاس پہنچے تو اس نے اسلام تو قبول نہ کیا، مگر ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور جواب میں لکھا کہ "مجھے یہ علوم ہے کہ ایک نبی آنا ابھی باقی ہے، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ شام میں نکلے گا۔ تاہم میں آپ کے ایلچی کے ساتھ احترام سے پیش آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں دو لڑکیاں بھیج رہا ہوں جو قبطیوں میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں۔" (ابن سعد) ان لڑکیوں میں سے ایک سیرین تھیں اور دوسری ماریہ قبطیہ (عیسائی حضرت مریم کو ماریہ MARY کہتے ہیں۔

مصر سے واپسی پر راستہ میں حضرت حاطب نے دونوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ ایمان لے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے سیرین کو حضرت حسّان بن ثابت کی ملک میں دے دیا اور حضرت ماریہ کو اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ ذی الحجہ ۸ھ میں انہی کے بطن سے حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے۔ (الاستیعاب۔ الاصابہ)

## قرآن میں رُومیوں کی فتح کی بشارت

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ڛ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ (الروم۔ آیت ۴)

ترجمہ:۔ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں، اور اپنی اس مغلوبیت کے چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائینگے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائینگے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصر روم ماریس MAURIC کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس PHOCAS تختِ سلطنت پر قابض ہو گیا۔ اس شخص نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کرایا، پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں برسرِعام لٹکوا دیے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو روم پر حملہ آور ہونے کے لیے بہترین اخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اس کا محسن تھا۔ اسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہوا تھا۔ اُسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اس بنا پر اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب

فوکاس سے اُس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اُس نے سلطنتِ رُوم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈیسا (موجودہ اُورفا) اور دوسری طرف شام میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ رُوم کے اعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اس نے اپنے بیٹے ہرقل HERACLIUS کو ایک طاقت ور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہرقل قیصر بنایا گیا، اور اس نے برسرِ اقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

خسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے پر اسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اس جنگ کو اس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو رومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہرقل آ کر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا، کنیسۃ القیامۃ SEPULCHRE برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیح نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انھوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بُری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو اُس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

"سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام رُوئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے

شعور بندے ہرقل کے نام،

تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟"

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ معظمہ میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں، اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو روم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اس وقت سلطنتِ روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کے رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآن مجید کی یہ سورۃ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے، اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔" اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دُور دُور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشین گوئی کے بعد آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف روم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضہ میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون CHALCEDON موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابہ زنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر

خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کرے۔" آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ CARTHAGE موجودہ ٹیونس منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض انگریزی مؤرخ گبن کے بقول قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی بلکہ غلبہ تو درکنار اس وقت تو کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔؎

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفارِ مکہ نے ان کا خوب مذاق اڑایا اور اُبَی بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آگئے تو دس اونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ قرآن میں فِی بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آئے ہیں، اور عربی زبان میں بِضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبَی سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہو گئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہو گی وہ سو اونٹ دے گا۔

۶۲۲ء میں ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، اور ادھر قیصر ہرقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحرِ اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہوا جہاں اس نے ایران پر پُشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اُسقفِ اعظم سرجیس SERGIUS نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض دی۔ ہرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں آرمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربائیجان میں گھس کر زرتشت کے مقام پیدائش ارمیاہ OLORUMIA کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کُن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیش گوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہو گئیں۔

پھر رُوم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوی کی فیصلہ کن لڑائی (۶۲۷ء) میں انھوں نے سلطنت ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرد (دسکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر

---

؎ GIBBON, DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE VOL. II PAGE 788 MODERN LIBRARY NEW YORK.

ہرقل کے لشکر عین طیسفون CTESIPHO کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دار السلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رونما ہوئی۔ وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیے گئے، اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں سے ہلاک ہو گیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی جسے قرآن "فتح عظیم" کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور یہی سال تھا جس میں خسرو کے بیٹے قباد ثانی نے تمام رومی مقبوضات سے دستبردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر "مقدس صلیب" کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المقدس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی۔ عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ اُبَیّ بن خلف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اونٹ ابوبکر صدیقؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انھیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ انھیں صدقہ کر دیا جائے، کیونکہ شرط اس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جوئے کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا ——— مگر اب حرمت کا حکم آچکا تھا، اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔

ابن عباس اور دوسرے صحابہ و تابعین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ روم و ایران کی اس لڑائی میں مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے ساتھ اور کفار کی ہمدردیاں ایران کے ساتھ تھیں۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ ایک یہ کہ ایرانیوں نے اس لڑائی کو مجوسیت اور مسیحیت کی لڑائی کا رنگ دے دیا تھا اور وہ ملک گیری کے مقصد سے تجاوز کر کے اسے مجوسیت پھیلانے کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد خسرو پرویز نے جو خط قیصر روم کو لکھا تھا اس میں صاف طور پر وہ اپنی فتح کو مجوسیت کے برحق ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے۔ اصولی اعتبار سے مجوسیوں کا مذہب مشرکین مکہ کے مذہب سے ملتا جلتا تھا، کیونکہ وہ بھی توحید کے منکر تھے، دو خداؤں کو مانتے تھے اور آگ کی پرستش کرتے تھے اس لیے مشرکین کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ ان کے مقابلہ میں مسیحی خواہ کتنے ہی مبتلائے شرک ہو گئے ہوں، مگر وہ خدا کی توحید کو اصل دین مانتے تھے، آخرت کے قائل تھے، اور وحی و رسالت کو سرچشمہ ہدایت تسلیم کرتے تھے۔ اس بنا پر ان کا دین اپنی اصل کے اعتبار سے مسلمانوں کے دین سے مشابہت رکھتا تھا، اور اسی لیے مسلمان قدرتی طور پر ان سے ہمدردی رکھتے تھے اور ان پر مشرک قوم کا غلبہ انھیں ناگوار تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک نبی کی آمد سے پہلے جو لوگ سابق نبی کو مانتے ہوں وہ اصولاً مسلمان ہی کی تعریف میں آتے ہیں اور جب تک بعد کے آنے والے نبی کی

دعوت انھیں نہ پہنچے اور وہ اس کا انکار نہ کردیں، ان کا شمار مسلمانوں ہی میں رہتا ہے۔

اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر صرف پانچ چھ برس ہی گزرے تھے اور حضورؐ کی دعوت ابھی تک باہر نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے مسلمان عیسائیوں کا شمار کافروں میں نہیں کرتے تھے۔ البتہ یہودی ان کی نگاہ میں کافر تھے، کیونکہ وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر چکے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ آغازِ اسلام میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی ہی کا برتاؤ ہوا تھا جیسا کہ سورہ قصص آیات ۵۲ تا ۵۵ اور سورۂ مائدہ آیات ۸۲ تا ۸۵ میں بیان ہوا ہے۔ بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ کھلے دل سے دعوتِ حق کو قبول کر رہے تھے۔ پھر ہجرت حبشہ کے موقع پر جس طرح حبش کے عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کی واپسی کے لیے کفارِ مکہ کے مطالبے کو ٹھکرا دیا اس کا بھی یہ تقاضا تھا کہ مسلمان مجوسیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کے خیرخواہ ہوں۔

## وفدِ نجران رسالت مآبؐ کی خدمت میں

۹ھ میں نجران کی عیسائی جمہوریت کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ اس وقت اس علاقے میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی اور تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی۔ ایک عاقب کہلاتا تھا، جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی۔ دوسرا سید کہلاتا تھا، جو ان کے تمدنی و سیاسی اُمور کی نگرانی کرتا تھا اور تیسرا اُسقف (بشپ) تھا، جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور تمام اہل عرب کو یقین ہو گیا کہ ملک کا مستقبل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے، تو عرب کے مختلف گوشوں سے آپ کے پاس وفد آنے شروع ہو گئے۔ اسی سلسلے میں نجران کے تینوں سردار بھی ۶۰ آدمیوں کا ایک وفد لے کر مدینے پہنچے۔ جنگ کے لیے بہرحال وہ تیار نہ تھے۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ آیا وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا ذمی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خطبہ نازل کیا تاکہ اس کے ذریعے سے وفدِ نجران کو اسلام کی طرف دعوت دی جائے۔

پہلا امر جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ہے کہ مسیح کی اُلوہیت کا اعتقاد تمہارے اندر جن وجوہ سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو

---

لہ مقاتل بن سلیمان کی روایت میں تصریح ہے کہ وفدِ نجران کی آمد پر وہ آیات نازل ہوئیں جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسٰی علیہما السلام کے بیان میں مشتمل ہیں اور جن کی تعداد ۳۰ یا اس سے کچھ زائد ہے (از مؤلف)

اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور ایسے معجزے عطا کرے جو نبوت کی صریح علامت ہیں اور منکرینِ حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دے بلکہ اس کو اپنے پاس اٹھا لے، مالک کو اختیار ہے، اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا، یا مالک کا بیٹا تھا، یا ملکیت میں اس کا شریک تھا۔

دوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسیح جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیح کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور نہ اس مذہب کی پیرو رہی جس کا اتباع مسیح کے حواری کرتے تھے۔

مسیحیت کے مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتب مقدس کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہلِ وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل بھی ہو گئے تھے۔ یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمھیں اپنے عقیدے کی صداقت پر پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوا۔

اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری جن کے تقدس کا سکہ دُور دُور تک رواں ہے در اصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں۔ جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔

## حبشہ سے وفد کی آمد

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ۔ (القصص۔ آیت ۵۲)

ترجمہ: "جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔"

اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام اہلِ کتاب (یہودی اور عیسائی) اس پر ایمان لاتے ہیں۔ بلکہ یہ اشارہ در اصل اس واقعہ کی طرف ہے جو اس سورہ کے نزول کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔

اس واقعہ کو ابنِ ہشام اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ہجرت حبشہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے ۲۰ کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیقِ حال کے لئے مکہ معظمہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجدِ حرام میں ملا۔ قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر گردو پیش کھڑے ہو گئے۔ وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات کیے، جن کا آپ نے جواب دیا۔ پھر آپ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن مجید کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سُن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انھوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جا لیا اور سخت ملامت کی کہ "بڑے نامراد ہو تم لوگ، تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لیے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انھیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔" اس پر انھوں نے جواب دیا کہ "سلام ہے بھائیو تم کو۔ ہم تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔" (سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۳۲۔ البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۸۲)

وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ. (القصص۔ آیت ۵۳)

ترجمہ: "اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ "ہم اس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں۔"

یعنی اس سے پہلے بھی ہم انبیاء اور کتبِ آسمانی کے ماننے والے تھے، اس لئے اسلام کے سوا ہمارا کوئی اور دین نہ تھا اور اب جو نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب لے کر آیا تھا اسے بھی ہم نے مان لیا ہے، لہٰذا

---

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ. (القصص۔ آیت ۵۵)

ترجمہ: "اور جب انھوں نے بیہودہ بات سُنی تو یہ کہہ کر کنارہ کش ہو گئے کہ "ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔" (مرتبین)

درحقیقت ہمارے دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ جیسے ہم پہلے مسلمان تھے ویسے ہی اب بھی مسلمان ہیں۔

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔ (القصص۔ آیت ۵۴)

ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ان کا اجر دوبار دیا جائے گا۔ اس ثابت قدمی کے بدلے جو انھوں نے دکھائی وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

یعنی ایک اجر اس ایمان کا جو وہ پہلے سیدنا عیسٰی علیہ السلام پر رکھتے تھے اور دوسرا اجر اس ایمان کا جو وہ اب نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لائے۔ یہی بات اس حدیث میں بیان کی گئی ہے جو بخاری و مسلم نے حضرت ابوموسٰی اشعری سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ثلثة لهم اجران رجل من اهل الكتاب امن بنبيه و امن بمحمد . . . . .

"تین شخص ہیں جن کو دہرا اجر ملے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو اہل کتاب میں سے تھا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا، پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لایا۔"

انھیں یہ دوہرا اجر اس بات کا ملے گا کہ وہ قومی و نسلی اور وطنی و گروہی تعصبات سے بچ کر اصل دین حق پر ثابت قدم رہے اور نئے نبی کی آمد پر جو سخت امتحان درپیش ہوا اس میں انھوں نے ثابت کر دیا کہ دراصل وہ مسیح پرست نہیں بلکہ خدا پرست تھے، اور شخصیت مسیح کے گرویدہ نہیں بلکہ "اسلام" کے متبع تھے۔ اسی وجہ سے مسیح کے بعد جب دوسرا نبی وہی اسلام لے کر آیا جسے مسیح لائے تھے تو انھوں نے بے تکلف اس کی رہنمائی میں اسلام کا راستہ اختیار کر لیا اور ان لوگوں کا راستہ چھوڑ دیا جو مسیحیت پر جمے رہ گئے۔

وہ بدی کا جواب بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیتے ہیں۔ جھوٹ کے مقابلے میں جھوٹ نہیں بلکہ صداقت لاتے ہیں، ظلم کو ظلم سے نہیں بلکہ انصاف سے دفع کرتے ہیں۔ شرارتوں کا سامنا شرارت سے نہیں بلکہ شرافت سے کرتے ہیں۔ اور وہ راہ حق میں مالی ایثار بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں اشارہ اس طرف بھی ہو کہ وہ لوگ محض حق کی تلاش میں حبش سے سفر کر کے مکے آئے تھے۔ اس محنت اور صرفِ مال سے کوئی مادی منفعت ان کے پیشِ نظر نہ تھی۔ انھوں نے جب سنا کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے انھوں نے ضروری سمجھا کہ خود جا کر تحقیق کریں تاکہ اگر واقعی ایک نبی ہی خدا کی طرف سے مبعوث ہوا ہو تو وہ اس پر ایمان لانے اور ہدایت پانے سے محروم نہ رہ جائیں۔

فصل ۲

# مسیحی عقائد اور تصورات کی اصلاح کیلیے قرآن کی تلقینات

## الوہیت مسیح کی تردید

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۚ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ۔ (النساء۔ آیت ۱۷۲)

ترجمہ: "مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔"

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۔ (المائدہ۔ آیت ۱۷)

ترجمہ: "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا مسیح ابن مریم ہی خدا ہیں۔"

عیسائیوں نے ابتداءً مسیح کی شخصیت کو انسانیت اور الوہیت کا مرکب قرار دے کر جو غلطی کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے مسیح کی حقیقت ایک معما بن کر رہ گئی جسے اُن کے علماء نے لفاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوشش کی اتنے ہی زیادہ اُلجھتے چلے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر اس مرکب شخصیت کے جزوِ انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیح کے ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا۔ اور جس کے ذہن پر جزوِ الوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیح کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت ہی سے مسیح کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنھوں نے نکالنی چاہی، انھوں نے سارا زور ایسی لفظی تعبیریں فراہم کرنے پر صرف کر دیا جن سے مسیح کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ خدا بھی سمجھا جا سکے۔ خدا اور مسیح الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک گروہ نے ان کا انکار کیا تو مخالفت میں اس حد تک پہنچ گیا کہ ان پر ناجائز ولادت کی تہمت لگائی اور اُن کو اپنے نزدیک سُولی پر چڑھوا کر چھوڑا۔ دوسرے گروہ نے ان کا اقرار کیا تو عقیدت میں بے تحاشا غلو کر کے ان کو خدا کا بیٹا بنا بیٹھا اور پھر ایک انسان کے خدا ہونے کا مسئلہ اس کے لیے ایسی گتھی بنا جسے سُلجھاتے سلجھاتے اس میں بے شمار فرقے بن گئے۔ ؎

وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ۝ لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ مَّا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ۔ (المائدہ۔ ایات ۷۲ تا ۷۵)



ترجمہ: "حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ "اے بنی اسرائیل، اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی"۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے ان کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا، اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے، اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی، اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں، پھر دیکھو یہ کدھر اُلٹے پھرے جاتے ہیں"

---

؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ج ۱، النساء، حواشی ۲۱۱، المائدہ، حواشی ۳۹، ۴۰، ۱۰۱، ۱۳۰)

ان چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدہ اُلوہیتِ مسیحؑ کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی ممکن نہیں ہے۔ مسیح کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الحقیقت وہ کیا تھا تو ان علامات سے بالکل غیر مشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، جس کا شجرۂ نسب تک موجود ہے، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو اُن تمام حدود سے محدود اور اُن تمام قیود سے مُقید اور ان تمام صفات سے مُتصف تھا جو انسان کے لئے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا، گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا، حتیٰ کہ جسے شیطان کے ذریعہ سے آزمائش میں بھی ڈالا گیا، اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک و سہیم ہے۔ لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں مسیح کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اُسے خدائی سے مُتصف قرار دینے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس تاریخی مسیح کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالمِ واقعہ میں ظاہر ہوا تھا، بلکہ انہوں نے خود اپنے وہم و گمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اُسے خدا بنا لیا تھا۔

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ وَلَا تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلۡحَقَّۚ إِنَّمَا ٱلۡمَسِيحُ عِيسَى ٱبۡنُ مَرۡيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ أَلۡقَىٰهَآ إِلَىٰ مَرۡيَمَ وَرُوحٞ مِّنۡهُۖ فَـَٔامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦۖ وَلَا تَقُولُواْ ثَلَٰثَةٌۚ ٱنتَهُواْ خَيۡرٗا لَّكُمۡۚ إِنَّمَا ٱللَّهُ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞۖ (النساء۔ آیت ۱۷۱)

ترجمہ:۔ "اے اہلِ کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک رُوح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ "تین" ہیں۔ باز آ جاؤ، یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔"

یعنی تین الٰہوں کے عقیدے کو چھوڑ دو خواہ وہ کسی شکل میں تمہارے اندر پایا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں۔ ان کی بناء پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصل دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتداء میں ان کو پیش آ گئی تھی

کہ کلام اللہ نے مسیح کی شکل میں ظہور کیا اور روح اللہ نے اس میں حلول کیا، اس کی وجہ سے اُنھوں نے مسیح اور رُوح القدس کی اُلوہیت کو بھی خداوندِ عالم کی اُلوہیت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ناقابلِ حل چیستاں بن گیا کہ عقیدۂ توحید کے باوجود عقیدۂ تثلیث کو، اور عقیدۂ تثلیث کے باوجود عقیدۂ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۸سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں۔ اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے۔ اسی پر ان کے سارے علمِ کلام کا زور صرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی، نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیح نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف ان کے غلو نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں، مسیح اور رُوح القدس کی اُلوہیت کا تخیل چھوڑ دیں، صرف اللہ کو الٰہِ واحد تسلیم کر لیں، اور مسیح کو صرف اس کا پیغمبر قرار دیں نہ کہ کسی طور پر شریک فی الُوہیت۔

إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۘ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝ (النساء۔ ۱۷۱)

ترجمہ:۔ "اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں اسی کی مِلک ہیں اور ان کی کفالت و خبر گیری کے لیے بس وہی کافی ہے۔"

یہ عیسائیوں کے ایک بڑے غلو کی تردید ہے۔ بائبل کے عہدِ جدید کی روایات اگر صحیح بھی ہوں تو ان سے (خصوصاً پہلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلق سے تشبیہ دی تھی اور "باپ" کا لفظ خدا کے لیے وہ محض مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ تنہا مسیح ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے بنی اسرائیل خدا کے لیے باپ کا لفظ بولتے چلے آرہے تھے اور اس کی بکثرت مثالیں بائبل کے پرانے عہد نامہ میں موجود ہیں۔ مسیح نے یہ لفظ اپنی قوم کے محاورے کے مطابق ہی استعمال کیا تھا اور وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب و غریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا مظہر ہے اور اس کے کلمے اور اس کی رُوح کا جسدی ظہور ہے، اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے، اور خدا نے اپنے اکلوتے کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ انسانوں کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب

پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسان کے گناہ کا کفارہ[1] ادا کرے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود مسیح علیہ السلام کے کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیلات کا آفریدہ ہے اور اُس غلطی کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متاثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدے کی تردید نہیں کی ہے۔ کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس سوال کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے کہ جب مسیح خدا کا اکلوتا تھا تو وہ صلیب پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے۔ اگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید کر دی جائے اور اس غلط فہمی کو دُور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے۔

زمین و آسمان کی موجودات میں سے کسی کے ساتھ بھی خدا کا تعلق باپ اور بیٹے کا نہیں ہے بلکہ محض مالک اور مملوک کا تعلق ہے۔

خدا اپنی خدائی کا انتظام کرنے کے لیے خود کافی ہے، اس کو کسی سے مدد لینے کی حاجت نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝ وَقَالُوا أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ ۝

(الزخرف۔ ۵۷ تا ۵۹)

---

[1] دینِ عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (یعنی حضرت عیسیٰؑ) کو صلیب پر "لعنت" کی موت دی جس سے وہ انسانوں کے گناہ کا کفارہ بن گیا اور انبیاء کی اُمتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے صرف عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی حتیٰ کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاء کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے نہ تو اپنے پیروؤں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا ہے تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ (از مؤلف)

ترجمہ: "اور جونہی کہ ابنِ مریم کی مثال دی گئی، تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنایا۔"

قدرت کا نمونہ بنانے سے مراد حضرت عیسیٰ کو بے باپ کے پیدا کرنا، اور پھر ان کو وہ معجزے عطا کرنا ہے جو نہ اُن سے پہلے کسی کو دیے گئے تھے نہ ان کے بعد۔ وہ مٹی کا پرندہ بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا۔ وہ مادر زاد اندھے کو بینا کر دیتے۔ وہ کوڑھ کے مریض کو تندرست کر دیتے۔ حتیٰ کہ وہ مردے کو جلا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ محض اس غیر معمولی پیدائش اور ان عظیم معجزات کی وجہ سے ان کو بندگی سے بالاتر سمجھنا اور خدا کا بیٹا قرار دے کر ان کی عبادت کرنا غلط ہے۔ ان کی حیثیت ایک بندے سے زیادہ کچھ نہ تھی جسے ہم نے اپنے انعامات سے نواز کر اپنی قدرت کا نمونہ بنا دیا تھا۔[1]

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (الزخرف۔ آیات ۸۲ تا ۸۵)

ترجمہ: "پاک ہے آسمانوں اور زمین کا فرمانروا عرش کا مالک، ان ساری باتوں سے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا، اور وہی حکیم و علیم ہے۔ بہت بالا و برتر ہے۔ وہ جس کے قبضے میں زمین اور آسمانوں اور ہر اس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے اور وہی قیامت کی گھڑی کا علم رکھتا ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔"

یعنی آسمان اور زمین کے خدا الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ساری کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ اسی کی حکمت

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، آل عمران، حواشی ۴۲ تا ۴۴۔ النساء ۱۹۰، المائدہ، حواشی ۴۰، ۴۶، ۱۲۷۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۱۵ تا ۲۲۔ الانبیاء، حواشی ۸۸ تا ۹۰۔ المؤمنون، حاشیہ ۴۳۔

اس پورے نظام کائنات میں کارفرما ہے، اور وہی تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔

اس کی ہستی اس سے بدرجہا بلند و برتر ہے کہ کوئی خدائی میں اس کا شریک ہو اور اس عظیم کائنات کی فرمانروائی میں کچھ بھی دخل رکھتا ہو۔ زمین و آسمان میں جو بھی ہے، خواہ وہ انبیاء ہوں یا اولیاء، فرشتے ہوں یا جن یا ارواح، ستارے ہوں یا سیارے، سب اس کے بندے اور غلام اور تابع فرمان ہیں۔ ان کا خدائی صفات سے متصف یا خدائی اختیار کا حامل ہونا قطعی ناممکن ہے۔

## حضرت عیسیٰؑ کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (المائدہ۔ ۴۶)

ترجمہ: "پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔"

یعنی مسیح علیہ السلام کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہی ایک دین، جو تمام پچھلے انبیاء کا دین تھا، مسیح کا دین بھی وہی تھا اور اسی کی طرف وہ دعوت دیتے تھے۔ تورات کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانہ میں محفوظ تھا اس کو مسیح خود بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اس کی تصدیق کرتی تھی (ملاحظہ ہو متی باب ۵ آیت ۱۷ - ۱۸) قرآن اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاء دُنیا کے کسی گوشے میں آئے ہیں ان میں سے کوئی بھی پچھلے انبیاء کی تردید کے لیے اور ان کے کام کو مٹا کر اپنا نیا مذہب چلانے کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ ہر نبی اپنے پیشرو انبیاء کی تصدیق کرتا تھا اور اسی کام کے فروغ دینے کے لیے آتا تھا جسے اگلوں نے ایک پاک ورثہ کی حیثیت سے چھوڑا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی کتاب اپنی ہی پچھلی کتابوں کی تردید کرنے کے لیے کبھی نہیں بھیجی بلکہ اس کی ہر کتاب پہلے آئی ہوئی کتابوں کی مؤید اور مصدق تھی۔

## حواریانِ عیسیٰؑ مسلم تھے

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوٰرِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا

وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝ (المائدہ۔ آیت ۱۱۱)

ترجمہ: "اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تب انھوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔"

یعنی حواریوں کا تجھ پر ایمان لانا بھی ہمارے فضل اور توفیق کا نتیجہ تھا، ورنہ تجھ میں تو اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ اس جھٹلانے والی آبادی میں ایک ہی تصدیق کرنے والا اپنے بل بوتے پر پیدا کر لیتا۔ ضمناً یہاں یہ بھی اشارۃً بتا دیا کہ حواریوں کا اصل دین اسلام تھا نہ کہ عیسائیت۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (المائدہ: آیت ۱۱۲ تا ۱۱۴)

ترجمہ: (حواریوں کے سلسلہ میں) یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم، کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے؟ تو عیسیٰؑ نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ انھوں نے کہا ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ اس پر عیسیٰ نے دعا کی۔ خدایا، ہمارے رب، ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلے پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تو بہترین رازق ہے۔"

چونکہ حواریوں کا ذکر آگیا تھا اس لیے سلسلۂ کلام کو توڑ کر جملہ معترضہ کے طور پر یہاں حواریوں ہی کے متعلق ایک اور واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مسیح سے براہ راست جن شاگردوں نے تعلیم پائی تھی وہ مسیح کو ایک انسان اور محض ایک بندہ سمجھتے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی اپنے مرشد کے خدا یا شریک خدا یا فرزند خدا ہونے کا تصور نہ تھا۔ نیز یہ کہ مسیح نے خود بھی اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک بندۂ بے

اختیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جو گفتگو قیامت کے روز ہونے والی ہے، اس کے اندر اس جملہ معترضہ کا کون سا موقع ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ معترضہ اس گفتگو سے متعلق نہیں ہے جو قیامت کے روز ہو گی بلکہ اس کی اس پیشگی حکایت سے متعلق ہے جو اس دنیا میں کی جا رہی ہے۔ قیامت کی اس ہونے والی گفتگو کا ذکر یہاں کیا ہی اس لیے جا رہا ہے کہ موجودہ زندگی میں عیسائیوں کو اس سے سبق ملے اور وہ راہ راست پر آئیں۔ لہذا اس گفتگو کے سلسلہ میں حواریوں کے اس واقعہ کا ذکر بطور ایک جملہ معترضہ کے آنا کسی طرح غیر متعلق نہیں ہے

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (المائدہ۔ آیت ۱۱۵)

ترجمہ: "اللہ نے جواب دیا۔ "میں اس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں، مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا اسے میں سزا دوں گا جو دنیا میں کسی کو نہ دی ہو گی۔"

قرآن اس بارے میں خاموش ہے کہ یہ خوان فی الواقع اتارا گیا یا نہیں۔ دوسرے کسی معتبر ذریعے سے بھی اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ یہ نازل ہوا ہو اور ممکن ہے کہ حواریوں نے بعد کی خوفناک دھمکی سن کر اپنی درخواست واپس لے لی ہو۔

## عیسائیوں کا اقامت انجیل سے انحراف

وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (المائدہ۔ ۴۷)

ترجمہ: "ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔"

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (المائدہ۔ ۴۴)

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (المائدہ۔ ۴۵)

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کیے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں، تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے قوانین پر فیصلہ

کرتا ہے، وہ دراصل تین بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے۔ کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہوسکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا، اس لیے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی واطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ البتہ جس طرح انحراف کے درجات ومراتب میں فرق ہے۔ اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے جو شخص حکم الٰہی کے خلاف اس بناء پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ مکمل کافر اور ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو اعتقاداً حکم الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملت تو نہیں ہے مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکم الٰہی سے انحراف اختیار کرلیا ہے۔ وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان واسلام اور کفر وظلم وفسق کی آمیزش ٹھیک ٹھیک اسی تناسب کے ساتھ ہے جس تناسب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے ان آیات کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے مگر کلام الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دیا ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حذیفہ نے فرمایا

> نعم الاخوۃ لکم بنو اسرائیل ان کانت لھم کل مُرۃ ولکم کل حلوۃ کلا واللہ لتسلکن طریقھم قدر الشراک۔

> کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لیے! ہرگز نہیں، خدا کی قسم تم انہی کے طریقہ پر قدم بقدم چلو گے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ

مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ؁ (المائدہ۔ آیت ۶۸)

ترجمہ: "صاف کہہ دو کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھادے۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔"

تورات اور انجیل کو قائم کرنے سے مراد راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کرنا اور انہیں اپنا دستورِ زندگی بنانا ہے۔ اس موقع پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ بائیبل کے مجموعۂ کتبِ مقدسہ میں ایک قسم کی عبارات تو وہ ہیں جو یہودی اور عیسائی مصنفین نے بطورِ خود لکھی ہیں اور دوسری قسم کی عبارات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات یا حضرت موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کے اقوال ہونے کی حیثیت سے منقول ہیں اور جن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے ایسا فرمایا یا فلاں نبی نے ایسا کہا۔ ان میں سے پہلی قسم کی عبارات کو الگ کرکے اگر کوئی شخص صرف دوسری قسم کی عبارات کا تتبع کرے تو بآسانی یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اگرچہ مترجموں اور ناسخوں اور شارحوں کی دراندازی سے، اور بعض جگہ زبانی راویوں کی غلطی سے، یہ دوسری قسم کی عبارات بھی پوری طرح محفوظ نہیں رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان میں بعینہٖ اسی خالص توحید کی دعوت دی گئی ہے جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے، وہی عقائد پیش کیے گئے ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے، اور اسی طریقِ زندگی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جس کی ہدایت قرآن دیتا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اسی تعلیم پر قائم رہتے جو ان کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رو گروہ پائے جاتے اور انہیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں پائی جاتی تھی۔ اس صورت میں ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے میں تبدیلِ مذہب کا سرے سے کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اسی راستہ کے تسلسل میں، جس پر وہ پہلے سے چلے آرہے تھے، آپ کے متبع بن کر آگے چل سکتے تھے۔

## عیسائیت اور یہودیت ذریعہ ہدایت نہیں

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ

حَنِيۡفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝ (البقرۃ۔ آیت ۱۳۵)

ترجمہ:۔ "یہودی کہتے ہیں۔ یہودی ہو تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو: نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا۔"

اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیے دو باتیں نگاہ میں رکھیے:۔

ایک یہ کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ "یہودیت" اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور "عیسائیت" جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیحؑ کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسرِ ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے، تو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء اور نیک لوگ، جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ "یہودیت" اور "عیسائیت" نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار اُن مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے، جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے، جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی کی صفات و خصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اُس راہِ راست سے منحرف ہو گئی ہیں جس پر حضرت ابراہیمؑ چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہو گئی ہے۔

وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (البقرہ۔ ۱۴۰)

ترجمہ:۔ "تمہاری حرکات سے اللہ غافل تو نہیں ہے۔"

یہ خطاب ان کے علماء سے ہے، جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ حق کو اپنے ہی فرقوں میں محدود سمجھتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاء کے مدتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے اور جو اجتہادی ضابطے

اور قاعدے ان کے فقہا، صوفیہ اور متکلمین نے وضع کیے۔ انہی کی پیروی پر انسان کی فلاح اور نجات کا مدار ہے۔ ان علماء سے جب پوچھا جاتا ہے کہ اگر یہی بات ہے تو حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب وغیرہ انبیاء علیہم السلام آخر تمہارے ان فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے، تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے، کیونکہ ان کا علم انہیں یہ کہنے کی تو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقے سے تھا لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ انبیاء نہ یہودی تھے، نہ عیسائی تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہو جاتی تھی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (المائدہ۔ آیت ۶۹)

ترجمہ:۔ یقین جانو کہ یہاں اجارہ کسی کا بھی نہیں ہے مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا بے شک اس کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے نہ رنج کا۔

یعنی یہ بات سن کر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کے بجائے وہ ضد میں آکر اور زیادہ شدید مخالفت شروع کر دیں گے۔ حالانکہ اللہ کے ہاں اصل چیز ان کی گروہ بندیاں نہیں ہیں بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے، وہ ایمان اور عمل صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہو گا وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔ خدا کے ہاں فیصلہ آدمی کی صفات پر ہو گا نہ کہ تمہاری مردم شماری کے رجسٹروں پر۔

## احبار و رہبان کا غلط مقام

وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ (التوبۃ۔ آیت ۳۱)

ترجمہ:۔ اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں۔ اُن لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔ خدا کی مار ان

پر یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتمؓ، جو پہلے عیسائی تھے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے تو انھوں نے منجملہ اور سوالات کے ایک یہ سوال بھی کیا تھا کہ اس آیت میں ہم پر اپنے علماء اور درویشوں کو خدا بنا لینے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو کچھ یہ لوگ حرام قرار دیتے ہیں اسے تم حرام مان لیتے ہو اور جو کچھ یہ حلال قرار دیتے ہیں اسے حلال مان لیتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ یہ تو ضرور ہم کرتے رہے ہیں۔ فرمایا بس یہی ان کو خدا بنا لینا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی سند کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کے لئے جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزعم خود متمکن ہوتے ہیں اور جو ان کے اس حق شریعت سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ انھیں خدا بناتے ہیں۔

یہ دونوں الزام، یعنی کسی کو خدا کا بیٹا قرار دینا، اور کسی کو شریعت سازی کا حق دے دینا اس بات کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں کہ یہ لوگ ایمان باللہ کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ خدا کی ہستی کو چاہے یہ مانتے ہوں مگر ان کا تصورِ خدائی اس قدر غلط ہے کہ اس کی وجہ سے ان کا خدا کو ماننا نہ ماننے کے برابر ہو گیا ہے۔"



## کھوکھلی رسم اصطباغ

صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً ۚ (البقرة۔ ۳۸)

ترجمہ:۔ "کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو گا۔"

مسیحیت کے ظہور سے پہلے یہودیوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جو شخص ان کے مذہب میں داخل ہوتا، اسے غسل دیتے تھے اور اس غسل کے معنی ان کے ہاں یہ تھے کہ گویا اس کے گناہ دُھل گئے اور اس نے زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ یہی چیز بعد میں مسیحیوں نے اختیار کر لی۔ اس کا اصطلاحی نام ان کے ہاں اصطباغ (بپتسمہ) ہے اور یہ اصطباغ نہ صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ان کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں، بلکہ بچوں

کو بھی دیا جاتا ہے۔ اسی کے متعلق قرآن کہتا ہے، اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے؟ اللہ کا رنگ اختیار کرو، جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا، بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے۔

# باب ۸

# عیسائیوں سے متعلّق مسلمانوں کے دو اہم مسائل

فصل ا

# اسلام کا ضابطۂ حلّت و حرمت اور ذبیحۂ اہلِ کتاب



## اہلِ کتاب کے ساتھ مواکلت و مشاربت کا اصول

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ (المائدہ۔ آیت ۵)

ترجمہ:۔ "آج تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں ان کے محافظ ہو، نہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔"

اہلِ کتاب کے کھانے میں ان کا ذبیحہ بھی شامل ہے۔ ہمارے لیے ان کا اور ان کے لیے ہمارا کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ اور کوئی چھوت چھات نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ۔ لیکن یہ عام اجازت دینے سے پہلے اس فقرے کا اعادہ فرما دیا گیا ہے کہ "تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب اگر پاکی و طہارت کے ان قوانین کی پابندی نہ کریں جو شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، یا ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ خدا کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں، یا اس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام لیں، تو اُسے کھانا ہمارے لیے جائز نہیں۔ اسی طرح اگر اُن کے دسترخوان پر شراب یا سُور

یا کوئی اور حرام چیز ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔

اہلِ کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذبیحہ اہلِ کتاب ہی کا جائز ہے جبکہ انہوں نے خدا کا نام اس پر لیا ہو، رہے غیر اہلِ کتاب، تو ان کے ہلاک کیے ہوئے جانور کو ہم نہیں کھا سکتے۔

## وہ اشیاء جن کا کھانا حرام ہے

قرآن مجید میں گوشت کے استعمال پر جو حدود و قیود عاید کی گئی ہیں، اور پھر احادیث صحیحہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جو تشریحات فرمائی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

اوّلین قید، جسے قرآن میں چار جگہ صاف صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جسے اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، حرام ہے۔ یہ حکم مکی سورتوں میں سورۂ انعام (آیت ۱۴۵) اور سورہ نحل (آیت ۱۱۵) میں وارد ہوا ہے اور مدنی سورتوں میں سے سورۂ بقرہ (آیت ۱۷۳) اور سورۂ مائدہ (آیت ۳) میں اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔

سورۂ مائدہ جو آخری احکامی سورہ ہے، اس پر دو باتوں کا مزید اضافہ کرتی ہے، اوّل یہ کہ صرف وہی مردار حرام نہیں ہے جو طبعی موت مرا ہو، بلکہ وہ جانور بھی حرام ہے جو گلا گھُٹ کر، چوٹ لگ کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ دوم یہ کہ جو جانور مشرکین کی قربان گاہوں پر ذبح کیا جائے وہ بھی حُرمت کے حکم میں مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے ساتھ شریک ہے خواہ اس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے یا نہ لیا جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حرام اشیاء میں گدھے اور کچلیوں والے درندوں اور پنجوں والے شکاری پرندوں کو بھی شامل فرمایا ہے جیسا کہ بکثرت احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نیل الاوطار، کتاب الاطعمہ والصید والذبائح)

## ذبح کے لیے تذکیہ کی شرط

دوسری قید قرآن مجید یہ بیان کرتا ہے کہ صرف وہی جانور حلال ہے جس کا تذکیہ کیا گیا ہو۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ . . . . . . . . وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ قف (آیت: ۳)

ترجمہ: "حرام کیا گیا تم پر مرا ہوا جانور......... اور گلا گھونٹا ہوا اور چوٹ کھایا ہوا اور گرا ہوا اور ٹکر کھایا ہوا اور جس کو درندے نے پھاڑا ہو، بجز اُس کے جس کا تم نے تذکیہ کیا ہو۔"

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ جس جانور کی موت تذکیہ سے واقع ہے صرف وہی حرمت کے حکم سے مستثنیٰ ہے، باقی وہ صورتیں جن میں تذکیہ کے بغیر موت واقع ہو جائے، حرمت کا حکم ان سب پر جاری ہوگا۔ تذکیہ کے مفہوم کی کوئی تشریح قرآن میں نہیں کی گئی ہے اور نہ لغت اس کی صورت متعین کرنے میں کچھ مدد کرتی ہے۔ اس لیے لامحالہ اس کے معنی متعین کرنے کے لیے ہم کو سنت کی طرف رجوع کرنا ہوگا، سنت میں اس کی دو شکلیں بیان کی گئی ہیں۔

ایک شکل یہ ہے کہ جانور ہمارے قابو میں نہیں ہے، مثلاً جنگلی جانور ہے جو بھاگ رہا ہے یا اڑ رہا ہے یا وہ ہمارے قابو میں تو ہے مگر کسی وجہ سے ہم اس کو باقاعدہ ذبح کرنے کا موقع نہیں پاتے۔ اس صورت میں جانور کا تذکیہ یہ ہے کہ ہم کسی تیز چیز سے اس کے جسم کو اس طرح زخمی کر دیں کہ خون بہ جائے اور جانور کی موت ہمارے پیدا کردہ زخم کی وجہ سے خون بہنے کی بدولت ہو۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت کا حکم ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں اَمْرِ الدم بم شئت "جس چیز سے چاہو خون بہادو" (ابوداود، نسائی)

دوسری شکل یہ ہے کہ جانور ہمارے قابو میں ہے اور ہم اس کو اپنی مرضی کے مطابق ذبح کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں باقاعدہ تذکیہ کرنا ضروری ہے۔ اور اس کا طریقہ سُنت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اونٹ اور اس کے مانند جانور کو نحر کیا جائے اور گائے، بکری یا اس کے مانند جانوروں کو ذبح۔ نحر سے مراد یہ ہے کہ جانور کے حلقوم میں نیزے جیسی تیز چیز زور سے چبھوئی جائے تاکہ اس سے خون کا فوارہ چھوٹے اور خون بہہ کر جانور بالآخر بے دم ہو کر گر جائے۔ اونٹ ذبح کرنے کا طریقہ عرب میں معروف تھا، قرآن میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ اور سنتِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طریقہ سے اونٹ ذبح کیا کرتے تھے۔ رہا ذبح تو اس کے متعلق احادیث میں حسب ذیل احکام وارد ہوئے ہیں۔

## احادیث میں ذبح کے تفصیلی احکام

عن ابی ھریرۃ قال بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدیل بن ورقاء الخزاعی علی جمل اورق فی محاج منٰی الا ان الزکات فی الحلق واللبۃ

ولا تعجلوا الانفس ان تزھق۔ (دارقطنی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر بدیل بن ورقاء خزاعی کو ایک خاکستری رنگ کے اونٹ پر بھیجا تاکہ منیٰ کے پہاڑی راستوں پر یہ اعلان کردیں کہ ذبح کی جگہ حلق اور لبلبہ کے درمیان ہے[1] اور ذبیحہ کی جان جلدی سے نہ نکال دو۔"

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الذبیحۃ ان تفرس۔ (طبرانی)

ترجمہ: ابن عباس کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ ذبح کرتے ہوئے آدمی نخاع تک کاٹ ڈالے۔"

اس مضمون کی روایت امام محمد نے سعید بن المسیب سے بھی مرسلاً روایت کی ہے جس کے الفاظ ہیں۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی ان تنخع الشاۃ اذا ذبحت[2] ان احادیث کی بنا پر اور عہد نبوی اور عہد صحابہ کے معمول بہ عمل کی شہادتوں پر حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک ذبح کے لیے حلقوم اور مری (غذا کی نالی) کو اور مالکیہ کے نزدیک حلقوم اور ودجین (گردن کی رگوں) کو کاٹنا چاہیے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ ج ۱۔ ص ۲۵، تا ۳۰)

اضطراری اور اختیاری ذکات کی یہ تینوں صورتیں جو قرآن کے حکم کی تشریح کرتے ہوئے سنت میں بتائی گئی ہیں، اس امر میں مشترک ہیں کہ ان میں جانور کی موت یکلخت واقع نہیں ہوتی بلکہ اس کے دماغ اور جسم کا تعلق آخری سانس تک باقی رہتا ہے، تڑپنے اور پھڑپھڑانے سے اس کے ہر حصۂ جسم کا خون کھنچ کر باہر آجاتا ہے اور صرف سیلانِ خون ہی اس کی موت کا موجب ہوتا ہے۔ اب چونکہ قرآن نے اپنے حکم کی خود کوئی تشریح نہیں کی ہے اور صاحبِ قرآن سے اس کی یہی تشریح ثابت ہے۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ اِذَا مَا ذَکَّیْتُمْ سے یہی ذکاوت مراد ہے اور جس جانور کو یہ شرطِ ذکات پوری کیے بغیر ہلاک کیا گیا ہو وہ حلال نہیں ہے۔

ان صورتوں کے علاوہ قرآن مجید میں تذکیہ کی ایک اور شکل بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی جانور کو سدھائے ہوئے شکاری درندے نے مارا ہو، بشرطیکہ یہ سدھایا ہوا پرندہ اپنے مالک کے لیے شکار کو روک

---

[1] یعنی گردن کے اوپر سے نہیں کہ پہلے نخاع کٹ جائے بلکہ اندرونی حصہ ہے جہاں نرخرہ واقع ہے۔

[2] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا کہ بکری کو ذبح کرتے وقت نخاع تک کاٹ ڈالا جائے۔

رکھے۔ اس صورت میں اگر جانور درندے کے پھاڑنے سے مر بھی جائے تو وہ مذکّٰی شمار ہوگا۔

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّا اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ۔ (المائدہ۔ آیت ۴)

ترجمہ:۔ اور جن شکاری جانوروں کو تم سدھاتے ہو، جنھیں تم شکار کی تعلیم دیتے ہو جو خدا نے تمہیں سکھائی ہے، وہ جس جانور کو تمہارے لیے روک رکھیں گے اس کا گوشت کھاؤ۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اس حکم کی یہ تشریح فرماتے ہیں۔

فان امسك عليك فادركته حيا فاذبحه وان ادركته قد قتل و لم يأكل منه فكله وان اكل فلا تاكل (بخاری۔ مسلم)

ترجمہ:۔ "اگر وہ جانور کو تیرے لیے روک کر رکھے اور تو اسے زندہ پالے تو ذبح کر۔ اور اگر جانور تجھے اس حالت میں ملے کہ تیرے کتے نے اسے ہلاک کر دیا ہو لیکن اس میں سے کچھ کھایا نہ ہو تو اسے کھالو، لیکن اگر کتے نے کھایا ہو تو پھر اسے نہ کھاؤ"

وان اَكَلَ منه فلا تاكل فانما امسك على نفسه۔

(بخاری۔ مسلم۔ احمد)

ترجمہ:۔ "اگر کتے نے اس میں سے کچھ کھالیا ہو تو اس جانور کو نہ کھا، کیونکہ اس نے وہ شکار اپنے لیے پکڑا تھا۔"

وماصدت بكلبك غير معلم فادركت ذكاته فكل (بخاری۔ مسلم)

ترجمہ:۔ "اور جو شکار تو نے بے سدھے کتے سے کیا ہو اسے اگر زندہ پا کر تو نے ذبح کر لیا ہو تو اسے کھالے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ سدھائے ہوئے شکاری درندے کا کسی جانور کو ہلاک کے لیے مارنا قرآن کی رُو سے شرطِ ذکات پوری کر دیتا ہے۔ اس لیے یہ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ کی حرمت سے خارج ہو کر اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کے حکم استثناء میں آجاتا ہے لیکن قرآن یہ حکم صرف سدھائے ہوئے شکاری درندے ہی کے لیے بیان کرتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اس حکم سے اس درندے کو بھی خارج کر دیتے ہیں، جو پالا ہوا ہو مگر شکار کے لیے سدھایا ہوا نہ ہو، لہٰذا اس پر کسی دوسری چیز کو قیاس کر کے اس کے چیرے پھاڑے ہوئے جانور کے جواز کا پہلو نہیں

نکالا جا سکتا۔ حدیث کے یہ الفاظ کہ بے سدھے کتے کا مارا ہوا شکار اگر تُو نے زندہ پا کر ذبح کر لیا ہو تو اسے کھالے اس امر کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ تذکیہ کے سوا جس دوسری صورت سے بھی کوئی جانور مرا ہو وہ مردار کے حکم میں ہے۔

## ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ کی شرط

تیسری قید قرآن میں یہ لگائی گئی ہے کہ جانور کو قتل کرنے کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اس حکم کو متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ ایجابی طور پر فرمایا گیا:۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ۝ (الانعام۔ آیت ۱۱۸)

ترجمہ:۔ "پس کھاؤ اس جانور کا گوشت جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان لانے والے ہو"

سلبی طریقے سے فرمایا گیا:۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ط (الانعام۔ آیت ۱۲۱)

ترجمہ:۔ "اور نہ کھاؤ اس جانور کا گوشت جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اور یقیناً یہ (یعنی اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرنا یا ایسے جانور کا گوشت کھانا) فسق ہے"۔

سدھائے ہوئے درندوں کے ذریعہ سے شکار کے معاملے میں بھی ہدایت فرمادی گئی:۔

فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ (المائدہ۔ آیت ۴)

ترجمہ:۔ "پس کھاؤ اس جانور کا گوشت جسے وہ تمہارے لیے روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام[1] لو اور اس سے ڈرو وہ جلدی حساب لینے والا ہے"۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن بہت سے مقامات پر لفظ ذبح استعمال ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی جگہ "جانور پر اللہ کا نام لینے" کے الفاظ بطور اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلٰى مَا

---

[1] کس پر اللہ کا نام لو، اس کی تشریح احادیث میں کی گئی ہے جو آگے آتی ہے۔

رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ (الحج۔ آیت ۲۸)

ترجمہ:۔ "تاکہ وہ اپنے لیے فائدے دیکھیں اور چند مخصوص دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں بخشے ہیں (یعنی ان کو ذبح کریں)"

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ (الحج۔ آیت ۳۴)

ترجمہ:۔ "ہر اُمّت کے لیے ہم نے ایک قربانی مقرر کی ہے تاکہ وہ اللہ کا نام لیں ان مویشی جانوروں پر جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ (یعنی ان کو ذبح کریں)"

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ ۖ (الحج۔ آیت ۳۶)

ترجمہ:۔ "پس ان اونٹوں پر اللہ کا نام لو کھڑا کر کے۔ (یعنی انھیں نحر کرو)"

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ۔ (الانعام: ۱۱۹)

ترجمہ:۔ "پس کھاؤ اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو (یعنی جسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو)"

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ۔ (الانعام آیت ۱۲۱)

ترجمہ:۔ "اور نہ کھاؤ اس میں سے جس پر نہیں لیا گیا اللہ کا نام (یعنی جسے اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کیا گیا ہو)"

ذبح کے لیے تسمیہ کی اصطلاح کا یہ مسلسل اور پے درپے استعمال اس امر کی صریح دلیل ہے کہ قرآن کی نگاہ میں ذبیحہ اور تسمیہ ہم معنی ہیں، کسی ذبیحہ حلال کا تصور تسمیہ کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، اور تسمیہ ذبیحہ حلال کی عین حقیقت میں شامل ہے۔

اب دیکھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایات صحیح اور قوی سندوں کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں، وہ ذبح کے لیے تسمیہ کی شرعی حیثیت کیا ظاہر کرتی ہیں۔ حاتم طائی کے صاحبزادے عدی بن حاتم وہ شخص ہیں جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اکثر شکار کے مسائل پوچھے ہیں ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام اس سلسلے میں بتائے وہ یہ ہیں۔

اذا ارسلت کلبك فاذکر اسم اللّٰہ فان امسك علیك فادرکتہ حیًا

فاذبحہ وان ادرکتہ قد قتل ولم یا کل منہ فکلہ واذا رمیت سھمك فاذکر اسم اللہ۔ (بخاری و مسلم)

ترجمہ:۔ "جب تم شکار پر اپنا کُتا چھوڑنے لگو تو اللہ کا نام لے لو، پھر اگر کُتا اس جانور کو تمہارے لیے روک رکھے اور تم اُسے زندہ پالو تو ذبح کر لیا کرو۔ اور اگر تم اسے اس حال میں پاؤ کہ کُتے نے اسے مار ڈالا ہے مگر اس میں سے کچھ کھایا نہیں ہے تو تم اسے کھا سکتے ہو۔.......... اور شکار پر تیر چھوڑتے وقت بھی اللہ کا نام لے لو۔"

وما صدت بقوسك فذکرت اسم اللہ علیہ فکل وما صدت بکلبك المعلم فذکرت اسم اللہ علیہ فکل۔

ترجمہ:۔ جس جانور کا شکار تم نے تیر کمان سے کیا ہو اور اس پر اللہ کا نام لے لیا ہو۔ اسے کھالو، اور جس کا شکار تم نے سدھے ہوئے کُتے کے ذریعے سے کیا ہو اور اس پر اللہ کا نام لے لیا ہو اسے بھی کھالو۔"

امر الدم بم شئت واذکر اسم اللہ۔ (ابو داؤد۔ نسائی)

ترجمہ:۔ "خون بہا دو جس چیز سے چاہو اور اللہ کا نام لے لو۔"

ما علمت من کلب او باز ثم ارسلتہ وذکرت اسم اللہ علیہ فکل مما امسك علیك۔ (ابو داؤد۔ احمد)

ترجمہ:۔ "جو کُتا یا باز تمہارا سدھایا ہوا ہے، پھر تم اسے شکار پر چھوڑو اور چھوڑتے وقت اللہ کا نام لے لو، تو جس جانور کو وہ تمہارے لیے روک رکھے اس کا گوشت تم کھا سکتے ہو۔"

عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اگر میں خدا کا نام لے کر اپنا کُتا چھوڑ دوں، پھر جب شکار کے پاس پہنچوں تو وہاں ایک اور کُتا بھی کھڑا نظر آئے، اور پتہ نہ چل سکے کہ دونوں میں سے کس نے یہ شکار مارا ہے تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ فرمایا:۔

فلا تاکل فانما سمیت علی کلبك ولم تسم علی غیرہ۔ (بخاری۔ مسلم۔ احمد)

ترجمہ:۔ "اسے نہ کھاؤ، کیونکہ تم نے خدا کا نام اپنے کُتے پر لیا تھا اور دوسرے کُتے پر تو نہیں لیا تھا۔"

خدا اور رسول کے ان صاف اور قطعی احکام کے بعد اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ شریعت

میں ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ شرط ہے اور جس جانور کو اللہ کا نام لیے بغیر مارا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے۔ ایسی صریح آیات اور احادیث سے بھی کوئی حکم ثابت نہ ہوتا ہو تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ آخر کسی حکم کے ثبوت کے لیے کس قسم کی نص درکار ہے؟

## تسمیہ کے بارے میں فقہاء کے مسالک

مذاہب فقہ میں سے حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ اس پر متفق ہیں کہ جس جانور پر قصداً خدا کا نام لینے سے احتراز کیا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے، البتہ اگر بھولے سے تسمیہ چھوٹ گیا ہو تو مضائقہ نہیں ہے۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، سعید بن المسیب، زہری، عطا، طاؤس، مجاہد، حسن بصری، ابو مالک، عبد الرحمان بن ابی لیلی، جعفر بن محمد اور ربیعہ بن ابی عبد الرحمان کا بھی یہی مسلک منقول ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تسمیہ عمداً چھوٹا ہو یا بھولے سے، دونوں صورتوں میں ذبیحہ حرام ہو جائے گا۔ ابن عمرؓ، نافعؒ، شعبیؒ اور محمد بن سیرینؒ کی یہی رائے ہے اور اسی کو ابو ثورؒ اور داؤد ظاہری نے اختیار کیا ہے۔ ابراہیم نخعیؒ سہواً چھوٹ جانے پر جانور کو مکروہ تحریمی سمجھتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ سرے سے شرط نہیں ہے، ذبح کے وقت خدا کا نام لینا ایک مشروع اور مسنون طریقہ تو ضرور ہے، تاہم اگر نہ لیا جائے، خواہ قصداً یا سہواً دونوں صورتوں میں ذبیحہ حلال ہوگا۔ صحابہ میں سے حضرت ابو ہریرہؓ اور مجتہدین میں سے امام اوزاعیؒ کے سوا کسی کا یہ مسلک نہ تھا۔ اگرچہ بعض روایات میں ابن عباسؓ، عطا بن ابی رباح، امام احمدؒ، امام مالکؒ کی طرف بھی یہ رائے منسوب کی گئی ہے، لیکن ان کا ثابت شدہ مسلک اس کے خلاف ہے۔

## شافعیہ کا نقطہ نظر اور اس کی کمزوری

اس رائے کے حق میں شافعیہ کی پہلی دلیل یہ ہے کہ آیت لَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ میں واؤ کو عطف کے معنی میں لینا بلاغت کے خلاف ہے، کیونکہ آیت کا پہلا ٹکڑا جملہ فعلیہ انشائیہ ہے اور دوسرا اسمیہ خبریہ۔ ایسے دو مختلف جملوں کے درمیان عطف درست نہیں ہو سکتا۔ اس دلیل سے وہ اس واؤ کو حالیہ قرار دے کر معنی یہ کرتے ہیں کہ "نہ کھاؤ اس جانور میں سے جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس حال میں کہ وہ فسق ہے"۔ پھر اس فسق کی تشریح سورۂ انعام کی آیت ۱۴۵ سے کرتے ہیں جس میں ارشاد ہوا ہے کہ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (یا وہ فسق ہو کہ اللہ کے سوا دوسرے کا نام اس پر لیا گیا ہو) اس طرح وہ

آیت کا مطلب یہ بنا دیتے ہیں کہ صرف غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا گوشت ہی حرام ہے، اللہ کا نام نہ لینے سے کوئی حرمت واقع نہیں ہوتی۔

لیکن یہ ایک بہت ہی کمزور تاویل ہے جس پر متعدد قوی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

اولاً آیت کے متبادر معنی ہرگز وہ نہیں ہیں جو اس تاویل سے بنائے گئے ہیں۔ آیت کو پڑھ کر اس معنی کی طرف ذہن خود بخود منتقل نہیں ہوتا، البتہ اگر آدمی پہلے یہ ارادہ کر لے کہ تسمیہ کے بغیر ذبح کیے ہوئے جانور کو حلال قرار دینا ہے، تب بہ تکلف اس آیت کے یہ معنی بنا سکتا ہے۔

ثانیاً۔ جملہ فعلیہ انشائیہ پر جملہ اسمیہ خبریہ کا عطف اگر بلاغت کے خلاف ہے تو حالیہ فقرے میں اِنَّ اور لام تاکید کا استعمال ہی کون سا بلاغت کے مطابق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو وہی بات کہنی ہوتی جو شوافع کہتے ہیں تو وَهُوَ فِسْقٌ (اس حال میں کہ وہ فسق ہو) فرماتا، نہ کہ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ (اس حال میں کہ یقیناً وہ ضرور فسق ہو)

ثالثاً۔ استدلال کے جوش میں، جملہ فعلیہ انشائیہ پر خبریہ کے عطف کو بلاغت کے خلاف کہتے ہوئے ان حضرات کو پوری آیت بھی یاد نہ رہی۔ پوری آیت یہ ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝

اس آیت میں اگر وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ کے واؤ کو حالیہ مان بھی لیا جائے تو جملہ فعلیہ انشائیہ پر اسمیہ خبریہ کے عطف سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔ کیونکہ اس کے بعد کا فقرہ لامحالہ خبریہ ہے جسے کسی طرح بھی حالیہ نہیں بنایا جا سکتا، اور اس کا عطف لامحالہ جملہ انشائیہ پر پڑ رہا ہے۔ پھر قرآن میں اس طرزِ کلام کی یہی ایک مثال نہیں ہے، بکثرت مقامات پر اسی طرح فعلیہ انشائیہ پر اسمیہ خبریہ کو معطوف کیا گیا ہے۔ مثلاً

فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (النور۔ آیت ۴)



وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ (البقرہ۔ آیت ۲۲۱)

اب یا تو اپنے بلاغت کے اصولوں پر نظرِ ثانی کر لیجیے، یا پھر کھل کر کہہ دیجیے کہ قرآن کا کلام بلاغت کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ ہر جگہ جہاں قرآن میں جملہ فعلیہ انشائیہ اور اسمیہ خبریہ کے درمیان واؤ ہے وہاں عاطفہ کو

حالیہ بنانا ممکن نہیں ہے۔

رابعاً۔ اس تاویل سے اس آیت کے معنی یہ بنتے ہیں کہ "نہ کھاؤ اس جانور میں سے جس پر نہ لیا گیا ہو اللہ کا نام اس حال میں کہ یقیناً وہ ضرور فسق ہو کر لیا گیا ہو اس پر غیر اللہ کا نام" سوال یہ ہے کہ اگر اصل مقصود صرف اس جانور کو حرام کرنا تھا جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو تو کیا آیت کا پہلا حصہ بالکل مہمل، فضول اور لایعنی نہیں ہو گیا؟ اس صورت میں یہ کہنے کے تو سرے سے کوئی معنی ہی نہیں رہتے کہ جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس میں سے نہ کھاؤ۔ اس کے بجائے مدعا صرف یہ کہنے سے حاصل ہو جاتا ہے کہ "نہ کھاؤ اس جانور میں سے جس پر لیا گیا ہو اللہ کے سوا کسی اور کا نام" کیا کوئی صاحب عقل آدمی اس بات کی کوئی معقول توجیہہ کر سکتا ہے کہ آخر یہاں لَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ کہنے کی حاجت ہی کیا تھی؟

خامساً۔ اگر واؤ کو حالیہ بھی مان لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ کی تفسیر ایک دور دراز کی ایک آیت کے الفاظ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ سے کریں۔ آخر کیوں نہ ہم اس آیت کے لفظ فسق کو اس معنی میں لیں جو از روئے لغت اس کے معنی ہیں، یعنی نافرمانی اور خروج از طاعت۔ اس صورت میں آیت کا سیدھا سادھا مفہوم یہ ہوگا کہ نہ کھاؤ اس جانور کا گوشت جس کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس حالت میں جب کہ وہ فسق ہو یعنی جب کہ جان بوجھ کر اللہ کا نام لینے سے احتراز کیا گیا ہو اس لیے کہ فسق کا اطلاق حکم کی دانستہ خلاف ورزی پر ہی ہوتا ہے نہ کہ سہواً چھوٹ جانے پر۔ یہ تاویل شافعیہ کی تاویل کے مقابلے میں زیادہ قابل ترجیح ہے، کیونکہ ایک طرف تو یہ ان تمام آیات اور احادیث سے مطابقت رکھتی ہے جو اس مسئلے کے متعلق وارد ہوئی ہیں اور دوسری طرف یہ تاویل اختیار کرنے سے آیت کا ایک پورا فقرہ (وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) بے معنی ہونے سے بچ جاتا ہے۔

دوسری دلیل حضرات شافعیہ یہ دیتے ہیں کہ ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا کہ کچھ لوگ (جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے) باہر سے ہماری بستی میں گوشت بیچنے آتے ہیں ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں یا نہیں۔ کیا ہم یہ گوشت کھا سکتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا:

سَمُّوا عَلَيْهِ اَنْتُمْ وَكُلُوْا.

ترجمہ: "تم خود ہی اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور کھاؤ" (یہ روایت بخاری، داؤد، نسائی اور ابن ماجہ

میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے)۔

اس سے شافعیہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ تسمیہ واجب نہیں کیونکہ اگر یہ واجب ہوتا تو حضورؐ شک کی حالت میں اس کا گوشت کھانے کی اجازت نہ دیتے۔ حالانکہ دراصل یہ حدیث ان کے مدعا کے خلاف پڑتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تسمیہ کا واجب ہونا عہدِ نبوی میں مسلمانوں کے اندر ایک معلوم و معروف مسئلہ تھا، اسی وجہ سے تو لوگ اُس گوشت کے متعلق پوچھنے آئے تھے جو نئے نئے مسلمان ہونے والے دیہاتی کاٹ کر لاتے تھے۔ ورنہ یہ سوال پیدا ہی کیوں ہوتا اور پوچھنے کا تکلف ہی کیوں کیا جاتا؟ پھر ان کے سوال کا جو جواب حضورؐ نے دیا وہ بھی اس خیال کی توثیق کرنے والا تھا۔ اگر ان لوگوں کا یہ خیال صحیح نہ ہوتا اور گوشت کے حلال یا حرام ہونے میں تسمیہ اور عدمِ تسمیہ کا درحقیقت کوئی اثر نہ ہوتا تو حضورؐ صاف صاف ان سے یہی فرما دیتے کہ ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ شرط نہیں ہے، تم لوگ ہر قسم کا گوشت کھا لیا کرو، خواہ ذبح کے وقت خدا کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ لیکن اس کے بجائے حضورؐ نے فرمایا تو یہ کہ تم خود خدا کا نام لے کر کھا لیا کرو۔ اس کا معقول مطلب جو بادنیٰ تامل آدمی کی سمجھ میں آجاتا ہے وہ یہ ہے کہ اول تو مسلمان کے ذبح کیے ہوئے گوشت کے متعلق تمہیں یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ قاعدے کے مطابق ٹھیک ذبح کیا گیا ہوگا اور اطمینان کے ساتھ اسے کھا لینا چاہیے۔ لیکن اگر تمہارے دل میں کوئی شک رہ ہی جاتا ہے تو رفعِ وسواس کے لیے خود بسم اللہ کہہ لیا کرو۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کے ذبیحے کے متعلق جو شہروں اور دیہات کی دکانوں پر ملتا ہے، آدمی کہاں تک یہ تحقیق کرتا پھر سکتا ہے، اور شریعت کب اس کو اس تحقیق کا مکلف کرتی ہے کہ اس نے حلال جانور کاٹا ہے یا حرام، تذکیہ کیا ہے یا نہیں، اور وہ نیا مسلمان ہے یا پرانا، تمام قواعد شرعیہ سے واقف ہے یا نہیں۔ بادی النظر میں آدمی کو مسلمان کی ہر چیز کو صحیح ہی سمجھنا چاہیے الا یہ کہ اس کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت سامنے آجائے۔ ثبوت کے بغیر جو شک دل میں پیدا ہوا ہے اسے وجہ اجتناب بنانے کے بجائے اس طرح کے شکوک کو بسم اللہ یا استغفر اللہ کہہ کر رفع کر دینا چاہیے۔ یہ تعلیم ہے جو اس حدیث سے ملتی ہے۔ تسمیہ کے عدمِ وجوب کی کوئی دلیل اس میں نہیں ہے۔

ایسا ہی کمزور استدلال وہ ایک تابعی بزرگ کی اس مُرسل روایت سے کرتے ہیں جسے ابو داؤد نے مراسیل میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذبیحۃ المسلم حلال ذکر اسم اللہ او لم یذکر انہ ان ذکر لم یذکر الا اسم اللہ۔

ترجمہ: مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے خواہ اُس نے اللہ کا نام لیا ہو یا نہ لیا ہو، وہ نام لے گا بھی تو ظاہر

ہے اللہ ہی کا لے گا"

یہ حدیث اوّل تو ایک غیر معروف تابعی کی مرسل روایت ہے۔ جس کا یہ وزن کبھی نہیں ہو سکتا کہ متعدد آیات اور مرفوع متصل احادیث سے جس چیز کا وجوب ثابت ہو رہا ہو اسے یہ غیر واجب ثابت کر سکے۔ پھر دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہ روایت قطعی صحیح بھی ہو تو کیا واقعی اس سے تسمیہ کا عدم وجوب ظاہر ہوتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ جو بات اس سے ظاہر ہوتی ہے وہ تو بس یہ ہے کہ کوئی مسلمان اگر خدا کا نام لیے بغیر جانور ذبح کر بیٹھا ہو تو اسے عمداً ترکِ تسمیہ پر محمول کرنے کے بجائے نسیان پر محمول کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اگر وہ نام لیتا تو اللہ ہی کا لیتا غیر اللہ کا نہ لیتا، اور اس بنا پر اس کے ذبیحہ کو حلال سمجھ کر کھا لیا جائے۔ اس سے یہ مضمون کہاں نکلتا ہے کہ جو لوگ ذبیحہ پر خدا کا نام لینے کے سرے سے قائل ہی نہ ہوں اور جن کا نظریہ ہی اس کے خلاف ہو، ان کا ذبیحہ بھی حلال ہے اور سرے سے ذبیحہ پر خدا کا نام لینا ہی ضروری نہیں ہے۔ اس حدیث کے الفاظ کو چاہے کتنا ہی کھینچا اور تانا جائے اس میں اس مفہوم کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔

یہ ہے کل کائنات ان دلائل کی جو فقہائے شافعیہ تسمیہ کے غیر واجب ہونے پر لاتے ہیں۔ کوئی شخص تقلید کی قسم کھا کر بیٹھ گیا ہو تو ممکن ہے وہ انھیں اٹل دلائل سمجھے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص ان کا تنقیدی جائزہ لے وہ کبھی یہ محسوس کیے بغیر رہ سکتا ہے کہ وجوبِ تسمیہ کے دلائل کے مقابلے میں یہ کس قدر بے وزن دلائل ہیں۔

پس جانوروں کے گوشت کی حلت کے بارے میں جو شرائط قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہیں وہ یہ ہیں کہ:-

۱۔ وہ ان اشیاء میں سے نہ ہو جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے فی نفسہٖ حرام قرار دیا ہے۔

۲۔ اُس کا تذکیہ کیا گیا ہو، اور

۳۔ اس کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

جس گوشت میں یہ تینوں شرائط پوری نہ ہوتی ہوں وہ طیبات سے خارج اور ان خبائث میں داخل ہے جن کا استعمال اہلِ ایمان کے لیے جائز نہیں ہے۔

## ذبیحۂ اہلِ کتاب کا مسئلہ

اب دیکھنا چاہیے کہ خاص طور پر ذبائح اہلِ کتاب کے بارے میں قرآن و سنت سے کیا حکم ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:-

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ۔ (المائدہ۔ آیت ۵)

ترجمہ:۔ ”آج تمہارے لیے طیبات حلال کر دیے گئے اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے ان کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال۔“

اس آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اہلِ کتاب کے دسترخوان پر جو کھانا ہمارے لیے حلال کیا گیا ہے وہ لازماً صرف وہی ہے جو طیبات میں سے ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ جو چیزیں ہمارے لیے قرآن و حدیث صحیح کی رو سے خبائث ہیں، جن کو ہم اپنے گھر میں یا کسی مسلمان کے گھر میں نہ خود کھا سکتے ہیں نہ کسی دوسرے کو کھلا سکتے ہیں، وہی چیزیں جب عیسائی یا یہودی کے دسترخوان پر ہمارے سامنے رکھی جائیں تو وہ ہمارے لیے حلال ہو جائیں۔ اس سیدھی اور صاف ”اویل کو چھوڑ کر اگر کوئی شخص دوسری تاویلیں کرنا چاہے تو زیادہ سے زیادہ چار باتیں کہہ سکتا ہے۔

ایک یہ کہ اس آیت نے ان تمام آیات کو منسوخ کر دیا جو گوشت کی حلت و حرمت کے متعلق سورۂ نحل، انعام، بقرہ اور خود اس سورۂ مائدہ میں وارد ہوئی ہیں، یعنی بالفاظِ دیگر یہ ایک ایسی آیت قرآن میں آگئی ہے جس نے جھٹکے ہی کو نہیں، مردار، سؤر، خون، نذر لغیر اللہ، سب کو مطلقاً حلال کر دیا۔ مگر اس نسخ کے لیے کوئی دلیل عقلی یا نقلی قیامت تک پیش نہیں کی جاسکتی۔ سب سے زیادہ کھلا ہوا ثبوت اس دعوے کی لغویت کا یہ ہے کہ گوشت کے بارے میں وہ تینوں قیود جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے خود اسی سورۂ مائدہ میں، اسی سلسلہ کلام میں، اس آیت سے بالکل متصل بیان کی گئی ہیں۔ کون صاحبِ عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک عبارت کے تین مسلسل و متصل فقروں میں سے آخری فقرہ پہلے دو کا ناسخ ہوا کرتا ہے۔

دوسری تاویل یہ کی جاسکتی ہے کہ اس آیت نے صرف تذکیہ اور تسمیہ کے احکام کو منسوخ کیا ہے۔ سؤر اور مردار اور خون اور وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کی حرمت کا حکم منسوخ نہیں کیا۔ مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان دونوں قسم کے احکام میں تفریق کے لیے اور ان میں سے ایک کے نسخ اور دوسرے کے بقا کے لیے بجز ایک خالی خولی ادعا کے کوئی دلیل بھی کسی کے پاس ہے۔ اگر دلیل کوئی صاحب رکھتے ہوں تو بسم اللہ وہ اسے پیش فرمائیں۔

تیسری تاویل یہ کی جاسکتی ہے کہ اس آیت نے مسلمانوں کے دسترخوان اور اہلِ کتاب کے دسترخوان میں

فرق کردیا ہے۔ مسلمان کے دسترخوان پر تو کھانے پینے کے معاملے میں وہ تمام قیود باقی رہیں گی جو قرآن میں مختلف مقامات پر بیان کی گئی ہیں، لیکن اہلِ کتاب کے دسترخوان پر وہ سب ختم ہو جائیں گی اور ہمیں آزادی ہوگی کہ جو کچھ بھی وہ ہمارے سامنے لا رکھیں اسے ہم کھالیں۔ اس تاویل کے حق میں بڑی سے بڑی دلیل جو دی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اہلِ کتاب کیا کچھ کھاتے ہیں، پس جب یہ جانتے ہوئے اس نے ہمیں ان کے ہاں کھانے کی اجازت دی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ وہ کھاتے ہیں وہ سب ہم ان کے ہاں کھا سکتے ہیں۔ خواہ وہ سور ہو یا مردار یا غیر اللہ کے نام کی قربانی یا جھٹکا۔ لیکن اس استدلال کی جڑ خود وہی آیت کاٹ دیتی ہے جس سے یہ دلیل نکالی گئی ہے۔ اس میں صاف کہا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کے ہاں تم صرف طیبات کھا سکتے ہو اور طیبات کے لفظ کو مبہم نہیں رہنے دیا گیا ہے بلکہ اس سے پہلے دو مفصل آیتوں میں کھول کر بتایا جا چکا ہے کہ طیبات کیا ہیں؟

چوتھی تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ اہلِ کتاب کے ہاں بس سور نہیں کھایا جاسکتا باقی سب کچھ کھایا جاسکتا ہے یا سور، مردار، خون اور وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ تو ہم نہیں کھا سکتے۔ مگر تذکیہ اور تسمیہ کے بغیر جو گوشت فراہم کیا گیا ہو اسے ہم کھا سکتے ہیں۔ مگر تاویل نمبر ۲ کی طرح یہ بھی محض ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔ کوئی معقول یا منقول دلیل اس معاملے میں پیش نہیں کی جاسکتی کہ قرآن کے احکام میں یہ فرق کس بنا پر کیا گیا ہے، اور اہلِ کتاب کے دسترخوان پر ایک حکم کیوں باقی رہتا ہے اور دوسرے کیوں مرتفع ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ تفریق اور استثناء قرآن سے ماخوذ ہے تو بتایا جائے کہ کس جگہ سے ماخوذ ہے۔ اگر حدیث سے نکالا گیا ہے تو معلوم ہو کہ کس حدیث سے اور اگر کوئی عقلی دلیل اس کی بنیاد ہے تو وہی سامنے لے آئی جائے۔

## ذبیحہ اہلِ کتاب کے معاملہ میں فقہاء کے مسالک

اس مسئلے میں حنفیہ اور حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے دسترخوان پر بھی ہمارے لیے کھانے پینے کے معاملے میں وہی قیود ہیں جو خود اپنے گھر میں کھانے کے لیے قرآن و سنت میں بیان کی گئی ہیں۔ تذکیہ اور تسمیہ کے بغیر ہم کوئی گوشت نہ اپنے ہاں کھا سکتے ہیں نہ یہود و نصاریٰ کے ہاں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد اول ص ۷۲۷ - ۷۳۰)

شافعیہ کہتے ہیں کہ یہودی اور نصرانی اگر غیر اللہ کے نام پر ذبح کریں تو اس کا کھانا حرام ہے، لیکن اگر وہ اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کریں تو ان کا ذبیحہ ہم کھا سکتے ہیں، کیونکہ تسمیہ سرے سے واجب ہی نہیں ہے، نہ مسلم کے لیے

نہ کتابی کے لیے (کتاب مذکور ج دوم ص ۲۳) اس مسلک کی کمزوری ہم اوپر واضح کر چکے ہیں اس لیے اس پر بحث کی حاجت نہیں۔

مالکیہ اگرچہ ذبیحہ کی حلت کے لیے تسمیہ کو شرط مانتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب کے لیے یہ شرط نہیں ہے، ان کا ذبیحہ خدا کا نام لیے بغیر بھی حلال ہے (کتاب مذکور ج دوم ص ۲۲) اس کے حق میں صرف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر یہودی عورت کا بھیجا ہوا گوشت کھا لیا تھا اور نہیں پوچھا تھا کہ وہ خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہے یا نہیں۔ لیکن یہ واقعہ تسمیہ کے حکم سے اہلِ کتاب کے استثناء کی دلیل اگر بن سکتا تھا تو صرف اُس صورت میں جب کہ یہ بات ثابت ہوتی کہ اُس زمانے میں عرب کے یہودی اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کرتے تھے اور پھر بھی حضورؐ نے اس امر سے واقف ہوتے ہوئے ان کا ذبیحہ نوش فرمالیا۔ محض اتنی بات کہ آپ نے وہ گوشت تناول فرماتے وقت تسمیہ اور عدم تسمیہ کے متعلق کچھ دریافت نہیں فرمایا، وجوبِ تسمیہ کے حکم سے اہلِ کتاب کے مستثنیٰ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ ممکن ہے کہ حضورؐ کو اپنے زمانے کے یہودیوں کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ اللہ کا نام لے کر ہی ذبح کرتے ہیں اسی لیے آپ نے بلا تامل ان کا لایا ہوا گوشت کھا لیا ہو۔

ابن عباسؓ کا قول یہ تھا کہ آیت طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ نے آیت لَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ کو منسوخ کر دیا اور اہلِ کتاب اس حکم سے مستثنیٰ کر دیے گئے (ابو داؤد کتاب الاضاحی)۔ لیکن یہ ابن عباس کی ذاتی تاویل ہے، کوئی حدیث مرفوع نہیں ہے۔ اور ابنِ عباس بھی اس رائے میں منفرد ہیں۔ کوئی دوسرا صحابی اس تاویل و تفسیر میں ان کا ہم خیال نہیں ہے۔ پھر کوئی معقول وجہ بھی انھوں نے اس بات کی بیان نہیں کی ہے کہ اس آیت نے اسی آیت کو کیوں منسوخ کر دیا، اور صرف اسی آیت کو منسوخ کر کے کیوں رہ گئی، کھانے پینے کے متعلق باقی سارے قیود کو بھی اس نے کیوں نہ منسوخ کر ڈالا۔

عطاء اور اوزاعی اور مکحول اور لیث بن سعد کا مسلک یہ تھا کہ اس آیت نے مَآ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ کو حلال کر دیا ہے۔ عطاء کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب کے ہاں ہم غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا گوشت کھا سکتے ہیں۔ اوزاعی کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے کان سے بھی سُن لو کہ عیسائی نے غیر اللہ کے نام پر کتا چھوڑا ہے تب بھی اس کا مارا ہوا شکار کھا لو۔ مکحول کہتے ہیں کہ اپنے کنیسوں اور اپنی مذہبی تقریبات کے لیے اہلِ کتاب جو قربانیاں کریں ان کے کھانے میں مضائقہ نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۳۹۵)۔ مگر اتنی بڑی بات کی دلیل

صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اہل کتاب غیر اللہ کے نام کی قربانیاں کرتے ہیں اور پھر بھی اُس نے فرمادیا کہ اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تو یہ بھی معلوم تھا کہ اہل کتاب میں سے نصاریٰ سؤر کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں پھر کیوں نہ ساتھ ساتھ سؤر اور شراب کی حلت کا حکم بھی اسی آیت سے نکال ڈالا جائے۔

ان مختلف مذاہب میں سے صحیح اور قوی مذہب ہمارے نزدیک حنفیہ اور حنابلہ کا ہے۔ باقی مذاہب میں سے کسی مذہب کی پیروی اگر کوئی کرنا چاہے تو اپنی ذمہ داری پر کرے، لیکن جیسا کہ اوپر بحث میں دکھایا جا چکا ہے کہ ان کے وجوہ و دلائل اس قدر کمزور ہیں کہ ان کی بنیاد پر کسی حرام کا حلال اور کسی واجب کا غیر واجب ثابت ہونا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں کسی خدا ترس آدمی کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ وہ ان مذاہب میں سے کسی کا سہارا لے کر یورپ اور امریکہ میں جھٹکے کا گوشت کھانا شروع کر دے۔ آخر میں دو باتوں کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

اول یہ کہ بسا اوقات چھوٹے جانور مثلاً مرغ، کبوتر وغیرہ ذبح کرتے ہوئے یہ صورت پیش آجاتی ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی سے جانور کی گردن کٹ کر سر دھڑ سے فوراً الگ ہو جاتا ہے۔ فقہاء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اس طرح کے ذبیحہ کو کھا لینے میں مضائقہ نہیں۔ اب اس چیز کو بنیاد بنا کر موجودہ زمانے کے بعض علماء نے فتویٰ دے دیا ہے کہ جہاں تک تمام جانوروں کیلئے ذبح کا طریقہ ہی یہ ہو کہ ایک مشین بیک ضرب سر کاٹ کر پھینک دے وہاں بھی تذکیہ کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن فقہاء کے اقوال کو نص بنا کر ان سے ایسے احکام مستنبط کرنا جو بجائے خود منصوص احکام میں ترمیم کر ڈالیں، کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔ تذکیہ کے متعلق شریعت کے احکام ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ اور وہ احکام جن نصوص پر مبنی ہیں وہ بھی ہم نے درج کر دیے ہیں۔ اب یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ اگر کچھ فقہاء نے احیاناً بلا ارادہ ان احکام کے خلاف کوئی واقعہ پیش آجانے کی صورت میں لوگوں کو کوئی سہولت دے دی ہے، تو اسے اصل قانون قرار دے لیا جائے اور شریعت کے احکام تذکیہ عملاً منسوخ کر دیے جائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ فقہاء نے یہ کہا ہے اور بالکل صحیح کہا ہے کہ مسلم اور اہل کتاب کے ہر ذبیحہ کے متعلق کھوج لگانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں؛ البتہ اگر ایجاباً یہ معلوم ہو کہ کسی ذبیحہ پر قصداً خدا کا نام نہیں لیا گیا ہے تو اس کے کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس کی بنیاد پر ہی

یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں جو گوشت ملتا ہے اس کے بارے میں کھوج لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اہلِ کتاب کا ذبیحہ ہے، اس کو اسی اطمینان کے ساتھ کھاؤ جس طرح مسلم ممالک میں مسلمان قصابوں سے گوشت خرید کر کھاتے ہیں۔ لیکن یہ بات صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب کہ ہمیں اہلِ کتاب کے کسی گروہ یا ان کی آبادی کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ اصولاً وعقیدۃً اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کے قائل ہیں۔ رہے وہ لوگ جن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ حرام وحلال کی ان قیود کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں، اور جو اصولاً یہ نہیں مانتے کہ جانور کے حلال اور حرام ہونے میں اللہ یا غیر اللہ کا نام لینے اور نہ لینے کا بھی کوئی دخل ہے، ان کے ذبیحہ پر یہ اطمینان کرنے کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے؟

فصل ۲



# نکاحِ کتابیہ

## (ایک سوال کا جواب)

ایک دوست کا تقاضا ہے کہ "فرنگیات" کی درآمد کا فتنہ بڑھتا جا رہا ہے، اور اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کی شرعی اجازت ایک بہانہ بن گئی ہے، لہٰذا اس کے متعلق شرعی احکام کی صحیح تشریح ہونی چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ فی الواقع یہ ایک بڑا فتنہ ہے۔ ہندوستان، مصر، شام وغیرہ ممالک میں تو اس کا اثر صرف اسی حد تک رہا ہے کہ میم صاحبات نے اسلامی نظامِ معاشرت میں گھس کر تہذیبِ اسلامی کی بیخ کنی فرمائی۔ لیکن ٹرکی میں اس کے سیاسی نتائج بھی نہایت خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔ یہ ان اہم اسباب میں سے ہے جن کی بدولت ترکوں کی عظیم الشان سلطنت تباہ ہوئی۔ اس بنا پر اگر دردمند مسلمانوں کو اس کے سدِباب کی ضرورت کا احساس ہو تو یہ بالکل جائز ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک مصالح کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر کسی شرعی مسئلہ میں ترمیم کرنا درست نہیں۔ قرآن مجید جس نے نازل کیا ہے وہ حکیم مطلق ہے اور اس کی نظر تمام مصالح و ضروریات پر غایت درجہ توازن و تناسب کے ساتھ پڑتی ہے۔ اس کے احکام کو سمجھنے اور حالات پر ان کو ٹھیک ٹھیک منطبق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حتی الامکان نظر کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے کر تمام چھوٹے اور بڑے مصالح کا جائزہ لیا جائے اور ہر ایک کو رعایت کا وہی درجہ دیا جائے جو خود شارع نے دیا ہے۔

قرآن مجید کی جس آیت میں اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ

أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْ أَخْدَانٍ ۝ (المائدہ : ۵)

ترجمہ :"آج تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کردی گئی ہیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی بھی پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے (تمہارے لیے حلال ہیں) بشرطیکہ تم اُن کو اُن کے مہر ادا کر کے قیدِ نکاح میں لاؤ نہ یہ کہ کھلم کھلا بدکاری کرنے والے یا چوری چھپے تعلقات رکھنے والے بنو"

## اختلافاتِ سلف

اس آیت کی تفسیر میں سلف کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہوئے ہیں۔ لیکن جمہور علماء نے ہر زمانے میں اس کے حکم کو ظاہر الفاظ اور عمومِ اطلاق ہی پر باقی رکھا ہے۔ اس لیے کہ کسی حکمِ قرآنی کو ظاہر سے پھیرنے اور عام کو خاص کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور یہاں سرے سے کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ قرآن بھیجنے والے سے بڑھ کر صاحبِ حکمت مقنن کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اپنے حکم میں کسی استثناء یا تخصص کی ضرورت سمجھتا تو وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے ساتھ کوئی قید ضرور بڑھاتا۔ اس کی شانِ تشریع سے یہ امر بہت بعید ہے کہ وہ قانونی احکام کے بیان میں اتنی چست زبان بھی استعمال نہ کر سکے جتنی دُنیا کے واضعین قانون استعمال کر لیتے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ اس کا مقصد تو اہلِ کتاب کے کسی خاص گروہ کو حلال کرنا ہو، اور وہ بیانِ حکم کے لیے الفاظ ایسے منتخب کرے جو تمام اہلِ کتاب کے لیے عام ہوں اور جن میں استثناء اور تخصیص کے لیے قطعاً کوئی اشارہ تک نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین اور آئمہ سلف نے عموماً اس آیت کو اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی عام اجازت پر محمول کیا ہے، اور صرف محمول ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس کے مطابق عمل بھی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن عفان نے نائلہ بنت فرافصہ کلبیہ سے نکاح کیا جو نصرانیہ تھی۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ نے ایک شامی یہودیہ سے نکاح کیا۔ حذیفہ بن الیمان اور کعب بن مالک اور مغیرہ بن شعبہ وغیرہم نے بھی کتابیات سے نکاح کیے یا ان کو نکاح کے پیغام دیے۔

## ابن عمر کا مسلک

صحابہؓ میں سے صرف ایک ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کو مطلقاً

ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں کو حرام کیا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (یعنی مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں) اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی شرک ہو سکتا ہے کہ عیسیٰ بن مریم یا کسی بندۂ خدا کو خدا قرار دیا جائے۔ اس بنا پر وہ تمام اُن اہل کتاب کی عورتوں کو حرام قرار دیتے ہیں جن کے اعتقاد میں کفر و شرک پایا جاتا ہو۔ وَالْمُحْصَنٰتُ کی تفسیر اُنھوں نے وَالْمُسْلِمَاتُ سے کی ہے۔ یعنی ان کی رائے میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو عورتیں مسلمان ہو جائیں ان کے ساتھ بھی نکاح کرنا تمہارے لیے حلال ہے۔ لیکن اس مسئلے میں ابن عمرؓ کی رائے درست نہیں جس کے وجوہ مختصراً ہم بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود ہی اہل کتاب کے وہ تمام عقائد بیان فرمائے ہیں جو صریح شرک پر مبنی ہیں۔ مثلاً ان کا یہ اعتقاد کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اور یہ کہ اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ اور وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ۔ یہی نہیں بلکہ اس نے لفظ شرک اور کفر کو بھی ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے کسی جگہ بھی ان کے لیے مُشرِک کا لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ تمام قرآن میں جہاں کہیں بھی ان کا ذکر آیا ہے، اہل کتاب یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے ساتھ ہی آیا ہے۔ قرآن کو اول سے آخر تک دیکھ جائیے۔ تین گروہ بالکل الگ الگ نظر آئیں گے۔ ایک گروہ مشرکین و کفار، یعنی وہ لوگ جن کے پاس کوئی آسمانی ہدایت محرف یا غیر محرف موجود نہیں ہے۔ دوسرے اہل کتاب، جو اپنی تمام اعتقادی و عملی گمراہیوں کے باوجود کسی نبی اور کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ تیسرے مومنین جن سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہیں، عام اس سے کہ وہ اسلام میں پیدا ہوئے ہوں، یا اہل کتاب کے گروہ سے اسلام میں آئے ہوں، یا مشرکین و کفار کے گروہ سے نکل کر مسلمان ہو گئے ہوں قرآن ان تینوں گروہوں کے درمیان واضح امتیاز برتتا ہے اور کہیں ان کو خلط ملط نہیں کرتا کہ مطلقاً اہل کتاب بول کر مشرک مراد لے، یا مطلقاً مشرک بول کر اہل کتاب مراد لے، یا اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کہہ کر مسلمان مراد لے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ فرما کر نکاح سے منع فرمایا اور دوسری جگہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کہہ کر نکاح کی اجازت دی، تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ پہلی آیت میں اَلْمُشْرِكٰتِ سے بت پرستوں اور دوسری غیر کتابی قوموں کی عورتیں مراد ہیں۔ اور دوسری آیت میں ان غیر مسلم گروہوں کی عورتیں مراد ہیں جن کے پاس قرآن سے پہلے کتابیں تھیں۔ اگر یہ معنی نہ لیے

جائیں تو قرآن کی دو آیتوں میں صریح تعارض لازم آتا ہے جس کو یہ کہہ کر رفع نہیں کیا جا سکتا وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد وہ عورتیں ہیں جو یہودیت اور نصرانیت چھوڑ کر مسلمان ہو گئی، یا اُن کتابی فرقوں کی عورتیں ہیں جو شرک و کفر سے پاک تھے۔ اس لیے کہ:

اولاً اللہ تعالیٰ نے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے پہلے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ فرما دیا ہے۔ اور مومنات سے صرف وہی عورتیں مراد نہیں ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئی ہوں بلکہ وہ سب عورتیں بھی مراد ہیں جو اپنے سابق مذہب چھوڑ کر اسلام میں آئی ہوں۔ پس جب مومنات سے نکاح کو عموماً حلال کر دیا تھا اور ان میں وہ عورتیں بھی آپ سے آپ داخل تھیں جو اسلام سے پہلے نصرانی یا یہودی تھیں، تو پھر خاص طور پر وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے ذکر کی کون سی ضرورت تھی؟ اس طرح تو یہ فقرہ بالکل بے معنی اور عبث ہو جاتا ہے۔

ثانیاً اس آیت سے پہلے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے جن کو کتاب دی گئی ہے۔ کیا وہاں بھی اہل کتاب سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نصرانیت اور یہودیت چھوڑ کر مسلمان ہوتے ہوں؟ اگر نہیں تو کس بناء پر جائز ہوا کہ ایک ہی آیت کے ایک ٹکڑے میں لفظ اہل کتاب کے ایک معنی لیے جائیں اور دوسرے ٹکڑے میں دوسرے معنی؟

ثالثاً نصاریٰ اور یہود کا کون سا فرقہ ایسا ہے جو شرک یا کفر سے پاک ہو؟ خدا کے بارے میں صحیح اعتقاد ان میں باقی ہی کہاں تھا اور کہاں سے آ سکتا تھا؟ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی اصل تعلیمات ہی ان کے ہاں محرف ہو چکی تھیں۔ پھر صحتِ اعتقاد کا راستہ مل کہاں سکتا تھا کہ ان میں کوئی فرقہ راہِ راست پر ہوتا؟ پس یہ خیال قطعاً صحیح نہیں کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے یہود و نصاریٰ کا کوئی صحیح العقیدہ گروہ مراد ہے۔ قرآن کی جن آیات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ صحیح العقیدہ فرقے بھی تھے، ان کا اشارہ دراصل ایسے اہلِ کتاب کی طرف ہے جو نیک دل اور سلیم الفطرت ہونے کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت قبول کر چکے تھے یا عنقریب کرنے والے تھے۔

رابعاً اگر بالفرض یہود و نصاریٰ کا کوئی خاص گروہ ایسا ہو بھی تو اللہ تعالیٰ نے الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے ساتھ کوئی قید ایسی نہیں بڑھائی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ یہ حکم صرف اسی گروہ کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے اہلِ کتاب اس سے خارج ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خواہ مخواہ

اہل کتاب کے اعتقادات کی چھان بین میں لگ جائیں اور اپنے قیاس سے یہ طے کر لیں کہ ان میں سے کس فرقے کی عورتیں حلال ہیں اور کس فرقے کی حرام۔

جن لوگوں نے حضرت ابن عمرؓ کے قول کی تائید کی ہے وہ آیت وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ لیکن یہ آیت خاص طور پر ان مردوں اور عورتوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو دار الحرب سے دار السلام کی طرف مسلمان ہو کر ہجرت کر آئے ہوں اور جن کے شوہر یا بیویاں دار الحرب میں بحالت کفر رہ گئی ہوں۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ان کے دار السلام میں آتے ہی جاہلیت کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور مہاجر مرد و عورت دونوں نکاح کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ معنی تو شانِ نزول کے لحاظ سے متحقق ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص نفس الفاظ ہی پر حصر کرے تو ہم کہیں گے کہ ایک جگہ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ سے ایک عام حکم بیان کیا گیا تھا، پھر دوسری جگہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کہہ کر بتا دیا گیا کہ کفار میں سے ایک خاص جماعت یعنی اہلِ کتاب اس عام ممانعت سے مستثنیٰ ہیں اگر آپ یہ نہیں مانتے کہ پہلے عام کو یہ دوسرا حکم خاص کر رہا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ متضاد باتیں کرتا ہے، ایک جگہ ایک چیز کی اجازت دیتا ہے اور دوسری جگہ اس کی ممانعت کر دیتا ہے۔ معاذ اللہ۔

## ابن عباسؓ کا مسلک

ابن عمرؓ کے بعد دوسرے صحابی جنہوں نے نکاح کتابیات کی اجازت کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے ابن عباسؓ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف ذمی عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ نصاریٰ اور یہود میں جو لوگ اسلامی سلطنت کی رعایا ہوں صرف انھیں کی عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے، خواہ ان کے اعتقادات میں کیسا ہی فساد ہو۔ رہے اہلِ حرب (یعنی وہ لوگ جو حدود دار الاسلام سے باہر رہتے ہوں) تو ان کی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ دلیل یہ ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ؁ (التوبۃ: ۴)

نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول کے دشمن ہوں ان سے محبت رکھنا اہلِ ایمان کا کام نہیں ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ....... يُوَآدُّوْنَ مَنْ

حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ (المجادلہ: ۲۲)

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ازدواجی تعلق کی بنیاد جس چیز پر رکھی ہے وہ مودت اور رحمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے

خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔ (الروم: ۲۱)

پس جب نکاح کا تعلق محبت و اخلاص کا مقتضی ہے، اور حربی مشرکین و اہلِ کتاب سے محبت رکھنا حرام، اور جنگ کرنا مامور بہ، تو لازم آیا ہے کہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہ ہو۔

یہ ہے ابن عباسؓ کا استدلال۔ مگر ابن عمرؓ کی طرح ان کی اس رائے کو بھی جمہور صحابہ و تابعین وائمہ متفقہین نے تسلیم نہیں کیا۔ اگرچہ دار الحرب اور دار الکفر کی رہنے والی کتابی عورت سے نکاح کو بالاتفاق سب مکروہ قرار دیتے ہیں، لیکن اس کی حرمت کا کوئی بھی قائل نہ ہوا۔ کیونکہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کی اجازت حربی اور غیر حربی سب کو شامل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں رکھی ہے۔ پس جہاں تک قانونی جواز کا تعلق ہے اس کو ٹھیک اسی عموم پر باقی رکھنا چاہیے جو آیت قرآنی میں پایا جاتا ہے۔ رہا قومی مصالح یا شخصی حالات کے لحاظ سے نکاح کا مناسب نہ ہونا اور اس کا لائق پرہیز ہونا، تو یہ بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ ہم جائز کو ناجائز نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ حق ہم کو حاصل ہے کہ جو فعل جائز کسی خاص حالت میں یا کسی خاص وجہ سے ہمارے لیے مناسب نہ ہو اس سے ہم پرہیز کریں، کیونکہ جواز کے معنی امر اور لزوم کے نہیں ہیں۔

## جمہور کا مسلک اور ان کے اختلافات

ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے کو رد کر دینے کے بعد جو لوگ آیت زیر بحث کے حکم کو عام قرار دیتے ہیں ان کے درمیان تمام تر اختلاف صرف دو لفظوں کی تفسیر میں ہے ایک اَلْمُحْصَنٰتُ دوسرے اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔

محصنہ کے معنی ایک گروہ کے نزدیک "پاک دامن عورت" کے ہیں۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ محصنہ وہ عورت ہے جو آزاد ہو، لونڈی نہ ہو۔ پہلے گروہ کے نزدیک اہلِ کتاب کی صرف ان عورتوں سے نکاح جائز ہے جو عفیفہ ہوں۔ بدکار اور آبرو باختہ اور بے حیا عورتیں اس حکم سے خارج ہیں۔ دوسرے گروہ کی رائے میں کتابیہ لونڈی سے نکاح جائز نہیں خواہ وہ عفیفہ ہی کیوں نہ ہوں، اور آزاد کتابیہ سے جائز ہے خواہ وہ بدکار ہی کیوں نہ ہو۔

اہلِ کتاب کے متعلق اختلاف اس امر میں ہے کہ کون کون سے گروہ ان میں شامل ہیں۔ امام شافعیؒ

کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب صرف وہ یہودی اور نصرانی ہیں جو بنی اسرائیل سے ہوں۔ رہیں دوسری قومیں جنہوں نے یہودیت ونصرانیت قبول کر لی ہے تو وہ اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ صرف بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے، دوسری قومیں ان کی دعوت کی مخاطب ہی نہ تھیں۔ حنفیہ اور جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ ہر وہ قوم جو کسی نبی کو مانتی ہو اور کسی کتابِ الٰہی پر ایمان رکھتی ہو، اہلِ کتاب شمار کی جائے گی۔ اس میں یہود ونصاریٰ کی بھی کوئی قید نہیں۔ اگر کوئی گروہ صحفِ ابراہیم کو ماننے والا یا صرف زبورِ داؤد پر ایمان رکھنے والا ہوتا تو وہ کتابی گروہ ہوتا۔ سلف میں ایک قلیل جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ جن قوموں کے پاس کوئی ایسی کتاب ہے جس پر آسمانی ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے وہ بھی اہلِ کتاب میں سے ہیں۔ مثلاً مجوسی۔ موجودہ زمانے کے بعض "مجتہدین" نے اسی خیال کو وسعت دے کر یہ اجتہاد فرمایا ہے کہ ہندو اور جینی اور بودھ مت والے بھی اہلِ کتاب ہیں اور ان کی عورتوں سے بھی نکاح جائز ہے، بہرحال ان کے ہاں بھی کوئی نہ کوئی نبی آیا ہوگا اور کوئی نہ کوئی کتاب ان کو ضرور دی گئی ہوگی۔

## صحیح مسلک

ان اختلافات میں جو مسلک سب سے زیادہ صحیح ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے مراد صرف یہود و نصاریٰ ہیں عام اس سے کہ وہ اسرائیلی ہوں یا غیر اسرائیلی۔ قرآن مجید میں اہلِ کتاب کا لفظ انہی دونوں گروہوں کے لیے آیا ہے اور ایک جگہ تو تصریح کر دی گئی ہے کہ یہی دو گروہ اہلِ کتاب ہیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اَنْ تَقُوْلُوْٓا
اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا۔ (الانعام: ۲۰۰)

ان دو گروہوں کے علاوہ جن دوسری قوموں کے پاس کتابیں بھیجی گئی تھیں، انہوں نے چونکہ اپنی کتابوں کو بالکل ضائع کر دیا اور ان کے اعتقاد و عمل میں کوئی چیز بھی تعلیماتِ انبیاء پر باقی نہیں رہی، اس لیے ان پر لفظ اہلِ کتاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کو اہلِ کتاب قرار نہیں دیا، حالانکہ وہ زردشت کو مانتے ہیں جس پر نبی ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ ہجر کے مجوسیوں سے جب معاملہ پیش آیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ سنوا بھم سنۃ اھل الکتب ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا سا معاملہ کرو، یہ نہیں فرمایا کہ اہلِ کتاب ہیں۔ پھر جو نامۂ مبارک آپ نے مجوسِ ہجر کو لکھا تھا اس میں صراحت کے ساتھ یہ تحریر فرما دیا تھا کہ :-

فان اسلمتم فلکم مالنا و علیکم ما علینا و من ابی فعلیہ الجزیۃ غیر اکل ذبائحھم ولا نکاح نساءھم۔

ترجمہ: "اگر تم اسلام قبول کرو گے تو تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور تم پر وہی واجبات ہوں گے جو ہم پر ہیں۔ اور جو لوگ تم میں سے انکار کریں گے ان پر جزیہ عائد کر دیا جائے گا مگر نہ ان کا ذبیحہ کھایا جائے گا اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے گا۔

اس تصریح کے بعد یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ غیر یہود و نصاریٰ کو بھی اکلِ ذبائح اور نکاحِ محصنات کی اغراض کے لیے اہلِ کتاب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

رہی اسرائیلیت کی قید جو امام شافعیؒ نے لگائی ہے تو وہ بھی درست نہیں۔ بلاشبہ دعوتِ موسوی و عیسوی کے مخاطب صرف بنی اسرائیل تھے۔ مگر جن غیر اسرائیلی قوموں نے نصرانیت کو قبول کیا انہیں بھی تو خدا اور رسولؐ نے اہلِ کتاب ہی میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نامۂ مبارک قیصرِ روم کے نام لکھا تھا اس میں یہ آیت نقل فرمائی تھی کہ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ دیکھیے، یہاں رومیوں کو اے اہلِ کتاب کہہ کر خطاب کیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ رومی اسرائیلی نہ تھے۔

پھر جن لوگوں نے محصنات کا ترجمہ عفیفہ یا حرّہ کیا ہے اور عفت یا حریت کو نکاحِ کتابیہ کے لیے مشروط قرار دیا ہے ان کا مسلک بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ احصان کے مفہوم میں عفت و شرافت دونوں داخل ہیں اور محصنہ سے مراد ایسی ہی عورت ہے جو پاک دامن بھی ہو اور شریف و معزز بھی۔ لیکن شارع کا مقصود ان دونوں چیزوں کو نکاح کے لیے شرط قرار دینا نہیں ہے بلکہ محض افضلیت اولویت کا اظہار مقصود ہے۔ شارع دراصل یہ بتانا چاہتا ہے کہ تم نکاح کرنے کو تو ہر مومن اور کتابی عورت سے کر سکتے ہو، مگر اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ وہ عورت محصنہ، یعنی شریف اور پاک دامن ہو۔ قرآنی احکام میں اس قسم کی قیود بکثرت لگائی گئی ہیں جو ثبوتِ حکم کے لیے شرط کی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ کسی فعلِ جائز کے افضل پہلو یا فعلِ ناجائز کے ارذل پہلو کو ظاہر کرنے کے لیے بطور ایک قیدِ زائد کے رکھ دی گئی ہے تاکہ اہلِ ایمان افضل کے اختیار اور ارذل سے اجتناب کا اہتمام کریں۔ بعینہٖ یہی مسلک ہے جو اس باب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا ہے۔ حضرت حذیفہ بن الیمان نے ایک یہودیہ سے نکاح کیا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع پہنچی تو آپ نے لکھا کہ اسے چھوڑ دو۔ انھوں نے دریافت کیا کہ یہ حکم کس بنا پر ہے؟ کیا کتابیہ

سے نکاح کرنا حرام ہے؟ آپ نے جواب دیا حرام نہیں ہے بلکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم لوگ اہل کتاب کی آبرو باختہ عورتوں میں نہ پھنس جاؤ۔

پس تمام مسالک میں جو مسلک ہمارے نزدیک اصح ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنے کے شرعی جواز کو عام قرار دیا جائے خواہ وہ حربیہ ہوں یا ذمیہ، عفیفہ ہوں یا نہ ہوں، لونڈیاں ہوں یا آزاد۔

یہاں تک تو مسئلہ کی صرف قانونی حیثیت سے بحث تھی۔ اب ہم اس پہلو سے اس مسئلے پر بحث کرتے ہیں کہ دینی و ملی مصالح کے لحاظ سے صحیح اور مناسب کیا طرزِ عمل ہے اور روح دین کے تقاضے کیا ہیں۔

## نکاح کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر

شریعتِ اسلامیہ میں نکاح کی حیثیت محض ایک عمرانی معاہدہ SOCIAL CONTPACT ہی کی نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ آج کل تعبیر کر رہے ہیں، بلکہ اس میں ایک مذہبی تقدس کی شان بھی ہے۔ یہ تقدس ہندوؤں اور عیسائیوں کے نکاح کی طرح SACRAMENT کی حد تک نہیں پہنچتا، مگر عبادت کی حد تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ شارع اس سے نہ صرف تمدنی و عمرانی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ دینی و روحانی فوائد بھی چاہتا ہے۔ اس سے اخلاق کی اصلاح مقصود ہے۔ سوسائٹی کی پاکیزگی مقصود ہے۔ ایک خالص اسلامی نظام معاشرت کا بقا و دوام اور نشوو ارتقاء مقصود ہے۔ دنیا میں خدا کا نام لینے والی اور کلمۃ اللہ کو بلند کرنے والی نسلیں پیدا کرنا مقصود ہے۔ ان مقاصد میں مددگار ہونے ہی کی وجہ سے نکاح کو عبادت کے قریب جگہ دی گئی ہے۔ بعض فقہاء اسلام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بعض حیثیات سے نکاح کو جہاد پر بھی فضیلت ہے۔ کیونکہ نکاح اور جہاد دونوں وجودِ مسلم اور وجودِ اسلام کے اسباب ہیں، مگر جو کچھ افرادِ مسلمین کی مناکحت سے حاصل ہوتا ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہے جو جہاد سے حاصل ہوتا ہے۔ جہاد میں تو زیادہ تر امکان اس کا ہے کہ کفار قتل ہوں گے یا ذمی بن کر حالتِ کفر ہی میں رہیں گے۔ بخلاف اس کے اہلِ اسلام کی شادیوں کا خاص نتیجہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی ایک نسل کے اخلاق محفوظ ہوں گے اور دوسری نسل مُتبعینِ اسلام کی وجود میں آئے گی۔

اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ان احادیث پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے

جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے متعلق مروی ہیں۔ ابویعلیٰ نے اپنی مُسند میں نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ عکاف بن وداع الہلالی سے پوچھا، کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ انہوں نے کہا، نہیں۔ آپ نے پوچھا لونڈی بھی نہیں؟ انھوں نے کہا، نہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا، کیا تم تندرست اور خوشحال ہو؟ انہوں نے عرض کیا، ہاں۔ آپ نے فرمایا۔ تب تو تم شیطان کے بھائیوں میں سے ہو یا عیسائیوں میں سے ہو۔ اگر تم ہماری جماعت میں شامل ہونا چاہتے ہو تو وہی کرو جو ہم کرتے ہیں اور ہمارے طریقوں میں سے ایک نکاح بھی ہے۔ تم میں بدترین لوگ وہ ہیں جو مجرّد رہتے ہیں اور تمہارے مرنے والوں میں بدترین وہ ہیں جو مجرد ہوتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ تناکحوا تناسلوا تکثروا فانی مکاثر بکم الامم یوم القیامۃ۔ "نکاح کرو، نسلیں بڑھاؤ، اپنی تعداد میں اضافہ کرو، کیونکہ میں قیامت کے روز تمام اُمّتوں کے مقابلے میں تمہاری تعداد زیادہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ایک موقع پر فرمایا؛

اربع من اعطیھن فقد اعطی خیر الدنیا قلبًا شاکرًا و لسانًا ذاکرًا و بدنًا علی البلاء صابرًا و زوجۃ لا تبغیہ حوبا فی نفسھا ومالہ۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

ترجمہ:۔ "چار چیزیں ہیں کہ جس کو وہ دی گئیں اسے دنیا اور آخرت کی ساری بھلائی دے دی گئی۔ ایک وہ دل کہ خدا جو کچھ دے اس پر وہ شکر ادا کرے۔ دوسرے وہ زبان جو خدا کا ذکر کرنے والی ہو۔ تیسرے وہ بدن جو مصیبتوں کے مقابلے میں ٹھیرنے کی قوت رکھتا ہو۔ چوتھے وہ بیوی جو شوہر کے مال اور اپنی عصمت میں کسی خیانت کی طرف مائل نہ ہو۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا۔

من اراد ان یلقی اللہ طاھرًا مطھرًا فلیتزوج الحرائر (ابن ماجہ)

ترجمہ:۔ "جو کوئی اللہ سے پاک صاف ملنا چاہتا ہو اسے شریف عورتوں سے شادی کرنی چاہیے۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

لا تزوجوا النساء لحسنھن فعسیٰ حسنھن ان یردیھن و لا تزوجوھن

لاموالهن فعسی اموالهن ان تطغیهن ولکن تزوجوهن علی الدین فلامة خرقاء سوداء ذات دین افضل۔ (ابن ماجة)

ترجمہ:۔ "عورتوں سے ان کے حُسن کی خاطر شادیاں نہ کرو، ممکن ہے کہ اُن کا حُسن اُن کو بگاڑ دے۔ اور تم ان کے مال و دولت کی خاطر بھی شادیاں نہ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے اموال اُن کو سرکش بنا دیں۔ تم کو ان میں جو چیز دیکھنی چاہیے وہ دین ہے۔ ایک کالی کلوٹی کم عقل لونڈی بھی اگر دیندار ہو تو وہ دوسری عورتوں سے افضل ہے۔"

اسی قسم کی بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نکاح کی اہمیت صرف ایک تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہی نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑا مقصد تحسینِ نفس، اور طہارتِ اخلاق، اور تہذیبِ اسلامی کا فروغ، اور خالص مسلمان نسلیں پیدا کرنا ہے۔ اور ان اغراض کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ مسلمان نکاح کریں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے نکاح ایسی عورتوں سے ہوں جو مسلمان ہوں، دیندار ہوں، شریف اور با عصمت ہوں۔ کیونکہ ایک صالح اسلامی سوسائٹی ایسے ہی مردوں اور عورتوں کے ازدواج سے وجود میں آسکتی ہے، اور ایک صالح مسلمان نسل ایسی ہی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

## مخلوط شادیوں کی مضرت

دینی نقطۂ نظر سے ہٹ کر خالص عمرانی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مخلوط شادیوں (MIXED MARRIAGES) سے بڑھ کر کوئی چیز نظامِ معاشرت اور خاندانی زندگی کو فاسد کرنے والی نہیں ہو سکتی۔ دو ایسے میاں بیوی جن کے خیالات میں بُعد المشرقین ہو اور جنہوں نے دو مختلف ماحولوں میں مختلف روایات اور مختلف معاشرتوں کے زیرِ اثر پرورش پائی ہو، اپنے باہمی اختلاط سے نہ تو خود اپنی زندگی میں سکون و راحت حاصل کر سکتے ہیں، نہ اپنے گھر کو کسی نظامِ معاشرت کا صالح رکن بنا سکتے ہیں، اور نہ کوئی ایسی نسل پیدا کر سکتے ہیں جو کسی نظامِ تمدن میں اچھی طرح کھپ سکتی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے درمیان محبت ہو اور آخر تک رہے۔ مگر ان کی محبت اور رفاقت زیادہ سے زیادہ صرف انہی کی ذات کے لیے لطف و لذت کی موجب ہو سکتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کا کوئی تمدنی فائدہ نہیں ہے۔ اختلافِ مذہب اور اختلافِ قومیت تو خیر بڑی چیز ہے۔ خاندانی زندگی کی کامیابی اور نظامِ تمدن کی بہتری کے لیے تو ایسی شادیاں بھی مفید نہیں ہوتیں جن کے دونوں فریق ایک ہی سوسائٹی کے دو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہوں۔ شہری اور دیہاتی

تمک کا فرق بارہا ناموافقت کا موجب بن جاتا ہے۔ نباہ کے لیے ضروری ہے کہ زوجین اور ان کے خاندانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ امور میں اتحاد ہو۔ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ان کا دین ایک ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا طرزِ معاشرت ایک ہو، ان کے خیالات اور اصولِ حیات میں یکسانی ہو، ان کے معاشی اور معاشرتی مرتبے میں ہمواری ہو، اور ان کی خاندانی روایات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو اصلاحِ شریعت میں کفاءت کہتے ہیں۔ شارع نے مناکحت میں کفو کو جو اہمیت دی ہے وہ اسی لیے ہے کہ زوجین میں زیادہ سے زیادہ مماثلت ہو، کیونکہ مماثلت صرف زوجین ہی کے لیے مودت و رحمت کی موجب نہیں ہے بلکہ پوری سوسائٹی کے لیے مفید ہے اور آئندہ نسلوں کی بہتری بھی اسی پر موقوف ہے۔ جن زوجین میں مماثلت نہیں ہوتی ان کی مواصلت محض ایک جسمانی مواصلت ہے جو تمدن و تہذیب کے نقطۂ نظر سے قطعی بانجھ یا قریب قریب بانجھ ہوتی ہے۔



## اختلافِ مذہب کے نقصانات

عدم کفاءت کے نقصانات تو صرف اسی قدر ہیں کہ اس سے زوجین میں مودت و رحمت کم اور نتیجہ خیز اشتراک کمتر ہوتا ہے۔ مگر اختلافِ مذہب و قومیت کے نقصانات اس سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ایک غیر مسلم ماں کی آغوش میں جو اولاد تربیت پا کر اُٹھے گی وہ دین و اخلاق کے اعتبار سے اسلامی سوسائٹی کے کسی کام کی نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ ایک مسلمان گھر میں غیر اسلامی طریقے رائج کرے گی اور جن جن کے گھروں سے اس کے روابط ہوں گے وہ سب کم و بیش اس عضوِ فاسد کے شر سے متاثر ہوں گے۔ پھر خود شوہر بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہے گا۔ اگر وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو تو ممکن ہے کہ اپنے دین و ایمان کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ لیکن یہ فساد اس حد تک نہ بھی پہنچے تو اس کا کم از کم یہ اثر تو ضرور ہوگا کہ وہ اپنے گھر میں اپنی آنکھوں سے اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب کے بہت سے ارکان کی بربادی ہوتے دیکھے گا اور اس کو گوارا کرے گا۔ سیاسی حیثیت سے بھی اس قسم کی شادیاں خالی از مضرت نہیں۔ سازش اور جاسوسی اور سلطنتِ اسلامی کی بیخ کنی کے لیے مسلمان گھر کی کافر بہو بہت آسانی کے ساتھ استعمال کی جا سکتی ہے، اور اگر وہ بہت ہوشیار ہو تو اپنے شوہر کو بھی ان اغراض کے لیے آلۂ کار بنا سکتی ہے۔ یہ سب وہ مضرتیں ہیں جو پہلے بھی ظاہر ہو چکی ہیں اور آج ظاہر ہو رہی ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے نظامِ معاشرت کو مشرکانہ رسموں اور جاہلانہ عادتوں سے کس نے آلودہ کیا؟ انہی عورتوں نے جو مذہب شرک پر قائم

رہ کر یا برائے نام مسلمان ہو کر مسلمان خاندانوں میں داخل ہوئیں۔ مسلمانوں کی نسلوں کو دین و اخلاق کے اعتبار سے کس نے تباہ کیا؟ انہی ماؤں نے جن کے سینوں سے مسلمانوں کے بچے شرک و جاہلیت کا دودھ پی پی کر بڑے ہوتے۔ اسلامی حکومتوں کو کس چیز نے غارت کیا؟ زیادہ تر ان کافر عورتوں کی محبت نے جو مسلمان امراء کے دلوں پر متصرف ہو گئی تھیں۔ آج اسلامی نظامِ معاشرت کی بنیادوں کو کون سی چیز کھوکھلا کر رہی ہے؟ ایک بڑی حد تک ان مغربی عورتوں کی حکومت جو ہماری سوسائٹی کے خوشحال اور بااثر طبقوں پر مسلط ہو گئی ہیں۔

## اسلامی قانونِ ازدواج کی شانِ اعتدال

جب حال یہ ہے تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرنا بالکلیہ ممنوع ہونا چاہیے تھا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ شارع نے اس چیز کو جائز رکھا؟ اس کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے ہم کو اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر نگاہ ڈالنی چاہیے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں شارع کا کمالِ حکمت اور اس کے طریقِ تشریع کا انتہائی اعتدال و توازن نظر آتا ہے۔

انسان جب کوئی قانون بناتا ہے تو عموماً وہ کسی ایک پہلو کی طرف اس قدر جھک جاتا ہے کہ دوسرے پہلو اس کی رعایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ اجتماعی مصالح پر زیادہ زور دیتا ہے اور شخصی مصالح نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور کبھی شخصی مصالح کی اتنی رعایت کرتا ہے کہ اجتماعی مصالح باطل ہو جاتے ہیں۔ مگر شارع اسلام کی حکیمانہ شان ایسی ہے کہ وہ ہر مصلحت پر نظر رکھتا ہے اور ہر ایک کی اتنی ہی رعایت کرتا ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اجتماعی مصالح کا، اور بڑی حد تک شخصی مصالح کا بھی اقتضا یہ تھا کہ مسلمانوں کی شادیاں مسلمان عورتوں ہی سے ہوں، اور پھر ان میں بھی مماثلت اور اتحاد کو ملحوظ رکھا جائے چنانچہ اسی لیے کفاءت ضابطہ مقرر کیا گیا۔

تخيروا لنطفكم وانكحوا الأكفاء (روى ذلك من حديث عائشة وانس وعمر من طرق عديدة)

ترجمہ: "اپنے نطفوں کے لیے اچھی قرارگاہیں تلاش کرو اور اپنے جوڑ کے لوگوں میں شادیاں کرو۔"

اور صاف بتا دیا گیا کہ کفاءت میں سب سے پہلے اور سب سے اہم چیز دین ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ

وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ۔ (التوبة: ۷۱)

ترجمہ:"مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ولی ہیں (اس لیے کہ) وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، بدی سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ (التحریم: ۶)

ترجمہ:"اے اہلِ ایمان اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔"

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ۔ (النساء: ۲۵)

ترجمہ:"اور تم میں سے جو کوئی پاک دامن مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ ان مومن لڑکیوں میں سے اپنے لیے جوڑا منتخب کرے جو تمہاری مملوک ہیں۔ اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے اور تم سب ایک دوسرے کے ہو۔"

تَزَوَّجُوْهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ فلامة خرقاء سوداء ذات دين افضل (الحدیث)

ترجمہ:"تم ان سے دین کی بنا پر شادیاں کرو کیونکہ ایک کالی کلوٹی کم عقل لونڈی بھی اگر دیندار ہو تو وہ دوسری عورتوں سے افضل ہے۔"

دوسری طرف بعض شخصی مصالح اس کی بھی مقتضی تھیں کہ غیر قوموں میں نکاح کرنے کا دروازہ قطعی طور پر بند نہ کر دیا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی غیر مسلم عورت کے عشق میں مبتلا ہو جائے اور حصولِ مقصود کا دروازہ بالکل بند پا کر حرام کی طرف جھک پڑے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں مسلم عورت بہم نہ پہنچ سکتی ہو اور مجرد رہنے کی وجہ سے اس کے اخلاق بگڑنے اور اس کی خانگی زندگی خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایسے مخصوص حالات کے لیے کسی حد تک رخصت کا دروازہ کھول دینا ضروری تھا چنانچہ شارع نے یہ دروازہ کھولا۔ مگر اس فتح باب میں شخصی مصالح کی رعایت کے ساتھ یہ بات ملحوظ رکھی کہ اجتماعی مصالح کو کم سے کم نقصان پہنچے۔

## مسلم اور غیر مسلم کے نکاح کی حرمت

سب سے پہلے تو یہ بات طے کر دی گئی کہ غیر مسلموں کے ساتھ شادی کرنے کی رخصت صرف مردوں کو دی جا سکتی ہے، عورتوں کے لیے یہ دروازہ قطعاً مسدود ہے۔

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ۔ (الممتحنۃ ۱۰)

ترجمہ:۔ "نہ مسلمان عورتیں کافر مردوں کے لیے حلال ہیں اور نہ کافر مرد مسلمان عورتوں کیلیے حلال۔"

یہ اس لیے کہ عورت کی فطرت ایک انفعالی فطرت ہے۔ اس میں ڈھال لینے سے زیادہ ڈھل جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ مرد کے اثرات اور اپنے ماحول کے اثرات کو زیادہ شدت کے ساتھ قبول کرتی ہے اور خانگی زندگی میں وہ عموماً شوہر سے مغلوب ہی ہو کر رہتی ہے۔ ایک غیر مسلم مرد سے اس کی شادی ہونے میں کم از کم ۹۰ فی صدی خطرہ اس بات کا ہے کہ اس کے پیٹ سے جو اولاد ہو گی وہ ملت کفر پر جائے گی۔ پس تمام مصالح و حکم اس بات کے مقتضی تھے کہ مسلمان عورتوں کے لیے غیر مسلموں کی زوجیت قطعی طور پر حرام کر دی جائے اور رخصت کا دروازہ اگر کھولا جائے تو وہ صرف مردوں کے لیے ہو۔

## مسلم اور غیر مسلمہ کے نکاح کے قیود

پھر مردوں کے لیے بھی یہ رخصت عام نہیں ہے۔ غیر مسلموں کو ازدواجی اغراض کے لیے دو طبقوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔

ایک وہ طبقہ جو اسلام اور اس کی تہذیب سے کوسوں دُور ہے، جس کے عقائد اور اصولِ حیات اور قوانینِ اخلاق و معاشرت کسی جہت میں بھی مسلمانوں سے نہیں ملتے۔

دوسرا وہ طبقہ جو تمام غیر مسلموں میں اسلام سے اقرب ہے، نبوت اور وحی کو کسی نہ کسی حد تک مانتا ہے، خدا اور یوم آخر کے اعتقاد میں بھی کسی حد تک اسلام کے قریب ہے، اصولِ اخلاق اور قوانینِ معاشرت میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ابھی تک اس کے پاس محفوظ ہیں جو منبع نبوت سے نکلی ہوئی ہیں۔

ان دونوں طبقوں میں سے پہلے طبقے کے ساتھ شادی بیاہ کرنا مسلمانوں کے لیے قطعی ممنوع کر دیا گیا۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى

الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ۔ (البقرۃ: ۲۲۲)

ترجمہ:۔ "اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو کتنی ہی پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کی شادیاں بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔ وہ آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور خدا اپنے اذن سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔"

## نکاحِ کتابیہ کی اجازت

رہا دوسرا طبقہ تو اس کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دے دی گئی، مگر اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ یہ کام خطرے سے خالی نہیں ہے، تاہم یہ رخصت صرف اس لیے عطا کی گئی کہ تم حرام کاری میں مبتلا نہ ہو۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (المائدہ۔ آیت: ۵)

ترجمہ:۔ "اور حلال کی گئی ہیں تمہارے لیے ان لوگوں کی شریف عورتیں بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے، بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے انھیں قیدِ نکاح میں لاؤ، علانیہ یا چوری چھپے زنا کاری نہ کرو اور یاد رکھو کہ جو شخص اپنے ایمان سے پھرا اس کا سب کیا کرایا غارت ہو جائے گا اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"

آخری فقرہ قابلِ غور ہے۔ اس میں صاف طور پر متنبہ کر دیا گیا ہے کہ غیر مسلم عورت سے شادی کرنے میں ایمان کا خطرہ ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ اگر ایسے خطرناک کام کی اجازت دی گئی ہے تو وہ غیر معمولی حالات و ضروریات ہی کے لیے ہے۔

## نکاحِ کتابیہ کی کراہیت

جو لوگ شریعتِ اسلام کی روح سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے اسی بنا پر اس اجازت کو ہمیشہ

رخصت ہی کے قبیل سے سمجھا اور اس کو پسند نہ کیا کہ مسلمانوں میں کتابیات سے شادی کرنے کا عام رواج ہو۔ شریعت کے سب سے بڑے رازدان اپنے عہد میں حضرت عمرؓ تھے۔ انہوں نے حضرت حذیفہ کو جو کچھ لکھا تھا وہ شریعت کے مقصد پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ زمانہ اسلام کے غلبے کا تھا۔ مسلمان علاقہ شام میں فاتح اور حکمران کی حیثیت رکھتے تھے۔ معاملہ ایک ایسے جلیل القدر مسلمان کا تھا جس نے براہِ راست شمعِ نبوت سے نورِ ایمان کا اکتساب کیا تھا۔ اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب میں اس سے بڑھ کر اور کون پختہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہ کو ایک کتابیہ کے ساتھ ازدواجی تعلق رکھنے سے منع کیا۔ پھر یہ نہیں فرمایا کہ کتابیہ سے شادی کرنا حرام ہے بلکہ یہ فرمایا کہ اس سے مسلمان گھروں میں اہلِ کتاب کی بداخلاق عورتوں کے گھس آنے کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھانا ہی بہتر ہے۔

غور کیجیے کہ جب غلبے کی حالت میں نکاحِ کتابیہ کے متعلق اسلام کا یہ طرزِ عمل ہے تو ایسی حالت میں کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے جب کہ ایک مسلمان کفار سے مغلوب اور مرعوب ہو اور ان کی سوسائٹی میں گھرا ہوا ہو۔ اس وقت تو نکاحِ کتابیہ کی کراہت اور زیادہ بڑھ جانی چاہیے، کیونکہ دارالکفر میں اس کی مضرتیں کئی گنی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اسلام نے عموماً نکاحِ کتابیہ کو مکروہ اور خصوصاً دارالکفر میں نہایت مکروہ قرار دیا ہے۔ شمس الائمہ سرخسی اپنی کتاب المبسوط میں لکھتے ہیں۔

یجوز للمسلم ان یتزوج کتابیة فی دار الحرب و لکنه یکره لانه اذا تزوجها ثم ربما یختار المقام فیهم ....... اذا ولدت تخلق الولد باخلاق الکفار وفیه بعض الفتنة یکره لهذا. . . . وسئل علی رضی الله عنه عن مناکحة اهل الحرب من اهل الکتاب فکره ذلک۔ (ج ۵۔ ص ۵۰)

ترجمہ:۔ "مسلمان کے لیے دارالحرب میں کتابیہ سے شادی کرنا جائز تو ہے مگر مکروہ ہے کیونکہ اگر وہ وہاں شادی کرے گا تو ممکن ہے کہ کفار ہی کے ملک میں رہ پڑے ...... اور جب کتابیہ کے پیٹ سے اولاد پیدا ہو تو وہ کفار کے اخلاق پر اٹھے۔ اس میں اور بھی فتنے ہیں۔ اس لیے یہ مکروہ ہے ...... حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حربی عورتوں کے ساتھ نکاح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اس کو مکروہ فرمایا۔"

امام ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"ذمیہ اور حربیہ دونوں سے نکاح جائز ہے بشرطیکہ نکاح کرنے والا ایسی جگہ نہ ہو جہاں اس کی اولاد کے کفر پر مجبور ہونے کا خوف ہو۔" (جزو سادس۔ ص ۶۱)

ہدایہ میں ہے کہ:۔

ویجوز تزویج الکتابیات والاولیٰ ان لا یفعل ولا یاکل ذبیحتھم الا الضرورۃ وتکرہ الکتابیۃ الحربیۃ اجماعاً لانفتاح باب الفتنۃ من امکان التعلق المستدعی للمقام معہا فی دار الحرب وتعریض الولد علی التخلق باخلاق اھل الکفر۔ (کتاب النکاح)

ترجمہ:۔ "کتابیات سے نکاح کرنا جائز تو ہے مگر بہتر یہی ہے کہ نہ کیا جائے اور نہ ان کا ذبیحہ کھایا جائے، الا یہ کہ کوئی ضرورت آپڑے۔ اور حربی کتابیہ سے نکاح کرنا تو بالاجماع مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عورت سے ایسا گہرا تعلق ہو جائے کہ مسلمان شوہر اسی کے ساتھ کافروں کے ملک میں رہ پڑے اور یہ کہ اس کی اولاد اہلِ کفر کے اخلاق سے متعلق ہو کر اُٹھے۔"

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کتابیہ کو حرام اور باطل ٹھہرانا تو درست نہیں ہے البتہ قانونِ اسلام کی رُوح اور ائمہ اسلام کے اجماع سے اس کا مکروہ ہونا اور خصوصاً دار الکفر میں، اور غلبہ کفار کی حالت میں نہایت درجہ مکروہ و مبغوض ہونا ثابت ہے۔ اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کے فعل سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ صرف نکاحِ کتابیہ ہی کے معاملے میں نہیں بلکہ شریعت کی تمام رخصتوں کے معاملے میں، جن سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا اندیشہ پایا جاتا ہو، مسلمانوں کے اولی الامر کو امتناعی احکام جاری کرنے کا حق ہے، اور اس قسم کے امتناعی احکام جائز کو ناجائز اور حلال کو حرام کیے بغیر نافذ کیے جا سکتے ہیں۔ مگر ایسے احکام جاری کرنے والوں میں اتنا تفقُّہ ہونا چاہیے کہ وہ قانونِ شریعت کی شانِ اعتدال کو ضائع نہ کریں۔

## نکاحِ کتابیہ میں ضروری احتیاط

اہلِ کتاب کی جن عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے ان کے بارے میں قرآن مجید دو شرطیں لگاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ محصنات (پاک دامن) ہوں، دوسرے یہ کہ ان سے نکاح کر کے ایک مسلمان خود اپنے ایمان کو خطرے میں نہ ڈال بیٹھے (ملاحظہ ہو سورۂ مائدہ آیت ۵) ان شرائط کی رو سے فاسق و

فاجر کتابیات کے ساتھ شادی جائز نہیں ہے۔ اور یہ دیکھنا ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جس سے وہ شادی کر رہا ہے وہ اس کے گھر میں، اس کے خاندان میں، اور اس کے بچوں میں ایسے افعال رائج کرنے کی موجب نہ بنے جو اسلام میں حرام ہیں۔ بلاشبہ وہ اسے مذہب ترک کرنے پر مجبور نہیں ہو سکتا۔ اس کو چرچ جانے سے نہیں روک سکتا۔ مگر اسے شادی سے پہلے ہی یہ شرط کر لینی چاہیے کہ وہ اس کی زوجیت میں آنے کے بعد شراب، سور کے گوشت اور دوسری حرام چیزوں سے اجتناب کرے گی۔ ایسی شرط پہلے ہی طے کر لینے کا اسے حق بھی ہے اور ایسا کرنا اس کا فرض بھی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں سخت تساہل کرنے والا آدمی ہے۔ اس کے بعد اگر اس کی اپنی اولاد ان حرام افعال میں مبتلا ہو (اور ظاہر ہے کہ اولاد کا ماں سے متاثر نہ ہونا متوقع نہیں ہو سکتا) تو اس کی ذمہ داری میں وہ بھی شریک ہو گا۔

# باب ۹



# متفرقات

## ضمیمہ (۱)

# ایک مسیحی بزرگ کے چند اعتراضات

امیدِ واثق ہے کہ ایک محقق اور طالبِ حقیقت کے ذیل کے استفسارات پر ترجمان القرآن کے توسط سے روشنی ڈالتے ہوئے نہ صرف مستفسر کو ہی بلکہ تمام ناظرین کو تشکر و امتنان کا موقع دیں گے۔

۱۔ قرآن نے مسیح کی نسبت چار وعدے ذکر کیے ہیں۔ چوتھا وعدہ ہے:

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ (آل عمران۔ ۴)

مسیح کے متبعین اور مسیح کے کافر دونوں کے وجود کا قیام قیامت تک پایا جانا اس بات کو مستلزم ہے کہ مسیح کے متبعین مسیح کے اتباع پر قائم رہیں۔ اور اتباع کے لیے مسیح کی ہدایت اور تعلیم کا قائم اور محفوظ رہنا اور پھر قیامت تک محفوظ رہنا ضروری ہے، جس سے لازم آتا ہے کہ مسیح ہی قیامت تک اپنی تعلیم اور ہدایت دائمی کی رُو سے دائمی ہادی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو درمیان میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے وجود کو گھسیڑنے کے کیا معنی؟ دوسرے اسلام کا تخالف پہلی صورتِ مُسلّمہ کے منافی معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ اہلِ اسلام کے نزدیک اگر مسیح آسمان پر زندہ ہیں اور وہی آنے والے ہیں اور پیغمبرِ اسلام کے ظہور سے پہلے بھی وہی اور بعد میں بھی وہی، تو اس صورت میں درمیان میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے ظہور کا کیا مطلب ہے، جبکہ غلبۂ متبعین مسیح کا وعدہ استمرار بلافصل کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا جا چکا ہے؟

۳۔ آیت فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ، لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (یونس۔ ۹۴)

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب خود پیغمبرِ اسلام بھی قرآن کی وحی کے متعلق شک میں پڑ جاتے تھے تو اس

صورت میں شک کو نکالنے کے لیے آپ کو حکم ہوا کہ اہلِ کتاب سے آپ اپنے شک کو نکلوا لیجئے، جس سے واضح ہے کہ یہ قرآن کریم پیغمبرِ اسلام کو بھی شک میں ڈالنے والی چیز ہے۔ اور اہلِ کتاب کی کتاب اور تعلیم ایسی چیز ہے کہ قرآن کے متعلق شک رکھنے والے کے شک کو بھی وہی دور کرتی ہے، تو اس صورت میں بھی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے ظہور سے اور مسیح کے بعد آنے سے کیا فائدہ ہوا؟ اور قرآن کریم کی نسبت تو یہ ہے، مگر تورات کی نسبت لکھا ہے۔ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ (آل عمران: ۹۳) جس سے ظاہر ہے کہ توراۃ قابلِ استشہاد ہے اور وہ اس صورت میں کہ محفوظ ہو اور محرف و مبدل نہ ہو۔ اور یہ صورت بھی پہلی صورت پیش کردہ کی مؤید ثابت ہوتی ہے۔

امید ہے کہ آپ ان ہر سہ سوالات پر جن کا مآلِ معنی واحد ہے، ایمانداری کے ساتھ خوب روشنی ڈالیں گے۔ ورنہ آپ کی خاموشی یا غلط اور ناقابلِ تسلی جواب سے کئی مسلمان کہلانے والے معزز اور اہلِ علم عیسائی ہونے والے ہیں۔ اور سات اشخاص تو ہو چکے ہیں۔ شاید آپ ابھی تک بے خبر ہی ہوں۔ حیدرآباد میں اندر ہی اندر آپ کو معلوم ہے کیا ہو رہا ہے؟ اور قدرت شاہ خان مبشر مسیحی کے ٹریکٹ "خط بنام مسلمانانِ حیدرآباد" نے کیا کچھ تہلکہ مچا دیا ہے کہ کئی خاندانوں کے خاندان عیسائی ہونے کیلئے تیار ہو رہے ہیں۔"

آپ کا مخلص ایک محقق

کاتبِ خط کوئی مسیحی پادری معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے مسلمان بن کر سوال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ ایک سچے عیسائی کی طرح سامنے آکر اعتراضات کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا اور اس صورت میں بھی ان کے اعتراض کا جواب اسی محبت سے دیا جاتا جس کے ساتھ ایک بھٹکے ہوئے مسلمان کو دیا جا سکتا ہے۔ خیر طریقِ اعتراض کے انتخاب میں وہ آزاد ہیں۔ ہمارا کام بہر حال ان کے اعتراض کو رفع کرنا اور انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے آپ کو اس بڑی اور بنیادی غلطی پر متنبہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو نہ صرف آپ نے کی ہے بلکہ مسیحی معترضین بالعموم اس میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ غلطی یہ ہے کہ آپ لوگ جب اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے آپ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک نئے مذہب کا نام ہے جس کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں ہوا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بانی تھے۔ اسی وجہ سے آپ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اگر تورات و انجیل برحق تھے تو ان کے بعد "اسلام" کیوں آیا اور "پیغمبرِ اسلام" کے ظہور کی

کیا ضرورت لاحق ہوئی؟ لیکن قاعدے کی بات ہے کہ اگر آپ کسی پر گرفت کرنا چاہتے ہوں تو اسے اُس دعوے پر پکڑیے جو اُس نے خود کیا ہو نہ کہ اس الزام پر جو آپ زبردستی اس کے سر منڈھ دیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کب کہا تھا کہ میں ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈال رہا ہوں؟ اور میرے اس نو ایجاد مذہب کا نام اسلام ہے؟ وہ تو اس بات کے سرے سے مدعی ہی نہیں ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ میں اسی مذہب کو لے کر آیا ہوں جسے مجھ سے پہلے عیسیٰؑ اور موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ لے کر آئے تھے اور اس مذہب کا نام ہمیشہ سے اسلام (خدا کی فرمانبرداری) ہی تھا نہ کہ یہودیت اور عیسویت۔ پھر وہ ان گذشتہ پیغمبروں کے بعد اپنے آنے کی جو وجہ بیان کرتے ہیں اس میں بھی کہیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ موسیٰ اور مسیح علیہم السلام کی تعلیمات دنیا سے بالکل مٹ گئی تھیں، یا بالکل مسخ ہو گئی تھیں اس لیے میں بھیجا گیا ہوں، بلکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اوّل تو توریت اور انجیل میں تحریف ہو گئی ہے۔ دوسرے اس تحریف کے باوجود جو خدائی تعلیمات ان دونوں میں صاف صاف پائی جاتی ہیں ان سے ہٹ کر پیروانِ موسیٰؑ نے ایک نیا نظام "یہودیت" کے نام سے اور پیروانِ عیسیٰ نے ایک دوسرا نظام "مسیحیت" کے نام سے بنا لیا ہے، اور ان دونوں مذہبوں میں بہت سی ایسی باتیں بنائے دین بنالی گئی ہیں جو اُس اسلام کے خلاف ہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ لے کر آئے تھے، اس لیے ضرورت پیش آئی کہ پھر اسلام کی اصل تعلیم کو اس کی خالص صورت میں، آمیزشوں سے چھانٹ کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے میں بھیجا گیا ہوں۔ یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل دعویٰ۔ اب اگر آپ گرفت کرنا چاہتے ہیں تو اس دعوے پر کیجیے۔ یہ آخر بحث و تحقیق کا کون سا طریقہ ہے کہ ایک شخص کی طرف آپ بطورِ خود ایک دعویٰ منسوب کرتے ہیں جس سے وہ بشدت انکاری ہے اور پھر اس کے دعوے پر نہیں بلکہ اپنے منسوب کیے ہوئے دعوے پر اعتراضات شروع کر دیتے ہیں۔ اس غلطی کا ارتکاب آج سے نہیں، ایک مدت سے مسیحی علماء کر رہے ہیں۔ اور یہی غلطی ہے جس پر ان کے اکثر و بیشتر اعتراضات کی بنا قائم ہے۔ اگر آپ واقعی ایک محقق ہیں تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ پہلے آپ ٹھنڈے دل سے اس امر کی تحقیق فرمائیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل دعویٰ وہ ہے جو میں بیان کر رہا ہوں یا وہ جو آپ ان کی طرف منسوب کر رہے ہیں؟ پھر اگر ثابت ہو کہ ان کا واقعی دعویٰ وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے تو یہ دیکھیں کہ آیا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب "اسلام" (خدا کی فرمانبرداری) تھا؟ کیا وہ ازلی و ابدی حقیقتیں جن کو ماننے

اور جن کے مطابق اخلاق و اعمال کو ڈھالنے پر انسان کی نجات کا انحصار ہے ہمیشہ سے وہی نہیں رہی ہیں جن کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی ہے؟ کیا خدا کے ہاں انسان کی نجات کا مدار ابراہیم اور اسحاق کے زمانے میں کچھ اور اصولوں پر اور بعد کے زمانے میں ان سے مختلف اصولوں پر ہو سکتا ہے؟ اگر آپ مانتے ہیں کہ یہ اصول ازلی و ابدی ہیں تو نو ایجاد مذہب یہودیت اور مسیحیت قرار پاتے ہیں یا اسلام؟ یہودیت اور مسیحیت میں تو آپ متعدد ایسی چیزیں پائیں گے جن کو اصولوں (یعنی مدارِ نجات) کا مرتبہ دیا گیا ہے حالانکہ وہ ایک خاص نسل یا ایک خاص زمانے تک محدود ہیں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں آپ قطعاً کوئی ایسی چیز نہیں پا سکتے جو نوعِ انسانی کی نجات کے عالمگیر ازلی و ابدی اصولوں سے زائد یا ان سے مختلف ہو۔ اس نقطۂ نظر سے آپ دیکھیں گے تو سوال کی نوعیت ہی بدل جائے گی۔ پھر تو سوال یہ نہ ہوگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیچ میں کہاں سے آگئے۔ بلکہ یہ ہوگا کہ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیم و اسحاق کے وقتوں سے جو اصل دین (اسلام) چلا آرہا تھا اس کے سلسلہ میں یہ یہودیت اور مسیحیت کہاں سے آداخل ہوئیں؟

۲۔ آپ نے پہلے اعتراض میں جو آیت نقل کی ہے اس میں مسیح کا انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں اور مسیح کا اتباع کرنے والوں میں نصاریٰ اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ اور اگر اتباع سے مراد اتباعِ کامل یعنی ٹھیک ٹھیک قدم بقدم چلنا مراد لیا جائے تب تو نصاریٰ اس کے مصداق نہیں رہتے، بلکہ صرف مسلمان ہی اس کے مصداق قرار پاتے ہیں۔ اس لیے کہ نصاریٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے اصل الاصول کو چھوڑ دیا اور یہودیوں کے بالمقابل ایک دوسرے طور پر اُن کے ساتھ کفر کیا۔ بخلاف اس کے مسلمان اسی تعلیم پر قائم رہے جو حضرت عیسیٰ نے اور ان سے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام نے دی تھی۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی رسول آئے ہیں خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے میں آئے ہوں، ان سب کی ایک ہی تعلیم تھی، اور وہ یہ تھی کہ خدائے واحد کی بندگی کرو۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ مجھ کو خدا مان لو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ۔ (آل عمران۔ آیت ۷۹)

ترجمہ: "کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے، اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم خدا پرست بن جاؤ۔"

اس مقدس گروہ کے ایک فرد حضرت عیسیٰ بھی تھے اور انہوں نے بھی کبھی عبدیت کے مقام سے بال برابر تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ۔ (النساء: ۱۷۲)

ترجمہ: "مسیح نے کبھی اس کو عار نہ سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو۔"

پس نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف الوہیت کی نسبت کرنا اور ان کو خدا کا بیٹا کہنا دراصل حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے، اور جو لوگ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں وہ آپ کے ساتھ ویسا ہی کفر کرتے ہیں جیسا کہ یہودی کرتے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ . . . . لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ۔ (المائدہ: ۷۲-۷۳)

ترجمہ: "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے، درآنحالیکہ خود مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے...... یقیناً کفر کیا انہوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔"

اس لحاظ سے اِتَّبَعُوْكَ کے اصل مصداق مسلمان اور وہ عیسائی ہیں جو مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا رسول مانتے ہیں، اُن کی طرف کسی درجہ میں الوہیت کو منسوب نہیں کرتے، اور اس عقیدۂ صالحہ کے قائل ہیں، اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ اور اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (النساء: ۱۷۱)

البتہ اگر اتباع سے مراد اتباع کامل نہ لیا جائے تو اس اعتبار سے مسلمانوں کی طرح عیسائی بھی متبعین مسیح میں داخل ہو جاتے ہیں، اور اللہ کا یہ وعدہ دونوں سے متعلق ہو جاتا ہے کہ ان کو یہودیوں پر غلبہ عطا فرمائے جنہوں نے مسیح کا قطعی اور کلی انکار کیا۔

۳۔ مسیح کی، اور صرف انہی کی نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ہدایت اور تعلیم اپنی اصل کے لحاظ سے قائم و محفوظ ہے، اور قیامت تک رہے گی۔ جیسا کہ ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

لہ مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کا رسول ہے اور وہ کلمہ ہے جو اللہ نے مریم پر اتارا اور اللہ کی طرف سے ایک روح ہے

لہ اللہ تو اکیلا ہی الٰہ ہے۔ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔

اُس تعلیم وہدایت کو مٹانے نہیں آئے تھے بلکہ اس کو ثابت اور مستحکم کرنے اور ان آمیزشوں سے پاک کرنے آئے تھے جو انسانی خواہشات اور بشری وساوس کی بدولت اس میں گھل مل گئی تھیں۔ نصاریٰ سے ان کی جنگ اس بات پر نہ تھی کہ وہ مسیح اور ان کی تعلیم وہدایت کو کیوں مانتے ہیں، بلکہ اس بات پر تھی کہ وہ اس کو کیوں نہیں مانتے۔ انہوں نے بار بار اپنے خدا کی طرف سے فرمایا کہ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ (النساء: ۱۷۱) اور يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ (المائدہ: ۶۸) اور وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ (المائدہ: ۶۶) اور وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ۔ (المائدہ: ۴۷)

مگر جب دیکھا کہ مسیح کے متبعین سرے سے انجیل ہی کھو بیٹھے ہیں اور انجیل کے نام سے مسیح کی چند سوانح عمریاں لیے پھرتے ہیں جن میں مسیح کی تعلیم وہدایت کا ایک بہت ہی خفیف حصہ اور وہ بھی آمیزشوں سے آلودہ پایا جاتا ہے تو انہوں نے نصاریٰ کے سامنے قرآن پیش کیا، اور کہا کہ جو کچھ تم نے کھو دیا تھا، وہ پہلے سے بھی زیادہ مکمل صورت میں پھر تمہارے پاس آگیا ہے۔ یہ وہی تعلیم ہے جو مسیح نے دی اور ان سے پہلے موسیٰ اور عیسیٰ اور نوح دے چکے ہیں۔ تم نے اور تم سے پہلے کی اُمتوں نے اس ہدایت کو بار بار گم کیا، مگر اب یہ ہدایت تم کو ایسی مستحکم صورت میں دی جاتی ہے کہ قیامت تک اس کو کوئی گم نہ کر سکے گا۔ پس درحقیقت متی اور مرقس اور لوقا اور یوحنا کی کتابوں میں نہیں بلکہ قرآن میں مسیح کی اصلی تعلیم قائم اور محفوظ ہے اور وہی انشاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔

۴۔ آپ کا یہ قول بھی محل نظر ہے کہ آیت زیر بحث سے لازم آتا ہے کہ "مسیح ہی قیامت تک اپنی تعلیم

---

۱ اے اہلِ کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو (یعنی حد سے نہ بڑھو)

۲ اے اہلِ کتاب تم کسی طرح حق پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل اور اُن کتابوں کو قائم نہ رکھو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کی گئی ہیں۔

۳ اور اگر وہ تورات اور انجیل اور ان کتابوں کو جو ان کے رب کی طرف سے ان کی طرف نازل کی گئی تھیں قائم رکھتے تو اوپر سے اور نیچے سے (ہر طرف سے) ان کو رزق ملتا۔

۴ اہلِ انجیل کو اُن احکام کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے انجیل میں نازل کیے تھے۔

اور ہدایت دائمی کی رُو سے دائمی ہادی ہے۔" یہ مفہوم آپ کے تخیل کا پیدا کردہ ہے۔ آیت کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے۔ وہاں تو صرف اس قدر کہا گیا ہے کہ جو تیرا انکار کرتے ہیں، ان پر ہم تیرا اتباع کرنے والوں کو قیامت تک غالب رکھیں گے۔ ان الفاظ سے یہ معنی کیونکر نکالے جا سکتے ہیں کہ اب تو ہی دائمی ہادی ہے اور تیرے بعد ہی ہدایت پیش کرنے کے لیے کوئی اور نبی نہ بھیجا جائے گا۔ افسوس کہ آیاتِ کتاب میں لفظی و معنوی تحریفات کرنے کی پرانی عادت ہمارے مسیحی بھائیوں میں سے ابھی تک نہیں گئی۔

۵۔ مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا مطلب آپ ہم سے پوچھنے کی بجائے خود مسیح علیہ السلام سے پوچھیے۔ جن کا یہ ارشاد تمام تحریفات کے باوجود کتاب یوحنا میں اب تک موجود ہے۔

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (تسلی دہندہ، یا وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔" (یوحنا۔ ۱۶: ۷-۸)

اور یہ کہ:

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کی رُوح جو باپ کی طرف سے نکلتی ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔" (یوحنا ۱۵: ۲۶)

اور یہ کہ:

"لیکن مددگار یعنی سچائی کی رُوح جسے باپ میرے نام سے بھیجے وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا۔ اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا ۱۴: ۲۶)

اور یہ کہ:

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" (یوحنا ۱۴: ۳۰)

اور یہ کہ:

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا

لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔" (۱۶: ۱۲-۱۳)

مسیح کے ان ارشادات سے آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ "غلبہ متبعین مسیح کا وعدہ، جو آپ کے نزدیک "استمرار بلافصل کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا گیا ہے" آنحضرتؐ کے ظہور سے ٹوٹتا نہیں، اور زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپ نے آکر مسیح کی گواہی دی (اِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ اور وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ) اور اس بہتانِ عظیم پر یہودیوں کو توبیخ کی جو وہ مسیح اور اس کی ماں پر رکھتے تھے۔ (وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا) اور وہ سب باتیں مسیحیوں کو یاد دلائیں جو مسیح نے ان سے کہی تھیں (وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيهِ) ... مسیح اسی لیے گئے تھے کہ اس دوسرے آنے والے کے لیے جگہ خالی کر دیں جو ان کے بعد آکر اس کام کو پورا کرنے والا تھا جسے وہ نامکمل چھوڑ گئے تھے۔

۶۔ آیت اِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ .... الخ میں اگرچہ خطاب بظاہر رسول اللہ علیہ وسلم کی طرف معلوم ہوتا ہے، مگر دراصل ہر وہ شخص اس کا مخاطب ہے جو قرآن پڑھے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے ناظر یا سامع اگر تجھے قرآن کی منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو جن لوگوں کے پاس قرآن سے پہلے آئے ہوئی کتابیں موجود ہیں ان سے دریافت کرلے، ان کی گواہی سے تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ اشارہ ان پیشگوئیوں کی طرف ہے جو انبیائے سابقین کی کتابوں میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق موجود ہیں۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے مثلاً

الَّذِينَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ (البقرہ: ۱۴۶)

ترجمہ:- "جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ خود اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے سچی بات کو چھپاتا ہے۔"

وَالَّذِينَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ۔ (الانعام: ۱۱۴)

ترجمہ:- "اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن درحقیقت تیرے پروردگار کی طرف سے اُترا ہوا ہے۔"

قرآن نے اپنی صداقت پر منجملہ بہت سی شہادتوں کے ایک شہادت انبیائے سابقین کی کتابوں سے بھی پیش کی ہے اور اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ بالخصوص ان لوگوں کو مطمئن کرنا مقصود ہے جو انبیائے سابقین کی کتابوں کو تو مانتے ہیں مگر قرآن کی صداقت میں شک کرتے ہیں اس لیے کہ کتب سابقہ کی گواہی انہی کے لیے معتبر ہو سکتی ہے اس طرح شہادت میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہو کہ قرآن شک میں ڈالنے والی چیز ہے۔ بات کو اس کے صاف اور واضح مفہوم سے پھیر کر پیچیدہ مطلب نکالنے کی کوشش کرنا کسی طالب حق کا کام نہیں۔ ان طریقوں کو ایسے لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے جو نزاع وجدال کی الجھنوں میں اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہوں۔

قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ سے پہلے ایک اور فقرہ تھا جس کو آپ نے دانستہ یا نادانستہ چھوڑ دیا۔ پوری آیت یہ ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰي نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

(آل عمران۔ آیت: ۹۳)

ترجمہ: "تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے بجز اُن کے جنہیں اسرائیل نے توراۃ کے نزول سے پہلے اپنے لیے حرام کر لیا تھا۔ اے محمدؐ کہو کہ تورات لے آؤ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔"

اس آیت میں یہود کو یہ الزام دیا گیا ہے کہ تم تورات کے احکام کو چھپاتے ہو۔ اور یہ الزام ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر دیا گیا ہے مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے:

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَآ اُولٰٓىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ۔

(المائدہ۔ آیت: ۴۳)

ترجمہ: "وہ تجھ کو اپنے معاملہ میں کیسے حکم بنائیں جب کہ خود ان کے پاس تورات موجود ہے۔ جس میں اللہ کا حکم ہے اور پھر وہ اس سے رُوگردانی کرتے ہیں وہ دراصل تورات پر ایمان نہیں رکھتے۔"

قرآن میں یہودیوں کے دو جرم بتائے گئے ہیں۔ ایک جرم یہ کہ وہ کتاب میں تحریف کرتے ہیں۔ دوسرا

یہ کہ تحریفات کے باوجود جو کچھ کتاب میں سچی خدائی تعلیم باقی ہے اس کو بھی اپنی خواہشاتِ نفس کے اتباع میں چھپاتے اور اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ یہاں اگر تورات سے استشہاد ہے تو وہ یہودیوں کے جرم پر ہے۔

اس سے آپ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟

## ضمیمہ (۲)

# پوپ پال ششم کا پیغامِ امن اور اس کا جواب

دسمبر ۱۹۶۷ء میں رومن کیتھولک چرچ کے پوپ کا ایک پیغام جو تمام دنیا کی دینی جماعتوں کے سربراہوں کے نام جاری کیا گیا تھا، مولانا محترم کو بھی وصول ہوا تھا۔ اس کا مولانا محترم نے جو جواب دیا تھا وہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اسے بشکریہ ترجمان القرآن اس مجموعے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

ڈیر پوپ پال ششم ؎

چند روز پہلے مجھے ڈاکٹر آر۔ اے بٹلر، ڈائرکٹر لویولا ہال، لاہور کے توسط سے آپ کا وہ نہایت قابلِ قدر پیغام پہنچا جس میں آپ نے نئے سال کا آغاز ایک "یومِ امن" کی تقریب سے کرنے کی اپیل کیتھولک چرچ کے معتقدین کے علاوہ تمام دنیا کے بڑے بڑے ادیان کے پیروؤں اور تمام نیک خواہشات رکھنے والے لوگوں سے کی تھی۔ اس پیغام کے متعلق میں اپنے خیالات آپ تک جلدی پہنچانا چاہتا تھا، مگر رمضان اور عید الفطر کی مصروفیات اس میں مانع رہیں۔ اب پہلی فرصت میں میں آپ کو خطاب کر رہا ہوں۔

میں آپ کو اس بات پر مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسے مقصد کی طرف دنیا کے انسانوں کو دعوت دی ہے جو سب کا مشترک مقصد ہے اور ساتھ ساتھ اُن اہم اسباب کی نشاندہی بھی کی ہے جو اس مقصد کے حصول میں سدِ راہ ہیں۔ فی الحقیقت امن ان اولین بنیادی ضروریات میں سے ہے جس پر بنی نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے مگر اس کی خواہش اور اس کی ضرورت کا احساس رکھنے کے باوجود

---

؎ خط انگریزی میں تھا اور ان الفاظ سے مکتوب الیہ کو خطاب کیا گیا تھا۔

جن وجوہ سے انسان ہمیشہ اس سے محروم ہوتا رہا ہے اور آج بھی محروم ہے وہ وہی وجوہ ہیں جن میں سے اکثر کی طرف آپ نے صحیح طور پر دنیا کے لوگوں کی توجہ دلائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک عملاً ان کو رفع کرنے کے لئے کچھ نہ کیا جائے گا محض پاکیزہ خواہشات اور تمناؤں کے اظہار سے کوئی امن دنیا کو میسر نہ آسکے گا۔ اس بنا پر میرے نزدیک یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص، قوم، مجموعہ اقوام اور پیروانِ مذہب کا گروہ پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ خود اپنا محاسبہ کر کے دیکھے کہ اس کی اپنی کوتاہیاں کیا ہیں جو اس کے ابنائے نوع کو، اور بالآخر خود اس کو امن سے محروم کرنے کی موجب ہوتی ہیں اور جہاں تک بھی اس کے امکان میں ہو اس کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ہم میں سے ہر ایک پوری صاف گوئی کے ساتھ اصلاح کی نیت سے، نہ کہ تلخی پیدا کرنے اور بڑھانے کے لئے دوسرے گروہوں کے نیک نیت لوگوں تک یہ بات پہنچانی چاہیے کہ ان کے طرزِ عمل میں کیا چیزیں ایسی ہیں جو اس کے گروہ کے لیے موجب اذیت ہوتی ہیں تاکہ وہ انہیں رفع کرنے کی کوشش کرسکیں۔

ٹھیک اسی غرض کے لیے میں آپ کو چند ایسے امور کی طرف توجہ دلا رہا ہوں جو مسلمانوں کے لیے اپنے مسیحی بھائیوں سے وجہ شکایت ہیں تاکہ کیتھولک چرچ کے پیشوائے اعظم ہونے کی حیثیت سے جو غیر معمولی اثر و رسوخ آپ کو مسیحی دنیا میں حاصل ہے، اس سے کام لے کر آپ اُن کی اصلاح کے لیے سعی فرمائیں۔ اور میں اس بات کا خیر مقدم کروں گا کہ ہمارے مسیحی بھائیوں کے لئے ہمارے طرزِ عمل میں اگر کوئی معقول وجہ شکایت ہو تو وہ ہمیں بتائی جائے۔ ہم انشاء اللہ ان کو رفع کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ دنیا میں امن اور صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے میں ہم سب اسی طرح مددگار بن سکتے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کریں۔ دوسروں سے فیاضانہ سلوک کرنے کی فراخ حوصلگی اگر ہم میں موجود نہ بھی ہو تو کم از کم اتنا تو ہو کہ دوسروں کی حق تلفی کرنے یا ان کو اذیت دینے سے تو ہم باز رہیں۔

مسیحی بھائیوں کے طرزِ عمل میں جو امور کسی ایک ملک یا قوم کے لیے نہیں، پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے وجہ شکایت ہیں، انہیں میں کسی لاگ لپیٹ کے بغیر مختصراً آپ سے بیان کیے دیتا ہوں۔

۱۔ ایک مدتِ دراز سے مسیحی اہلِ علم اپنی تحریروں اور تقریروں میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور اسلام پر جو حملے کر رہے ہیں، اور آج بھی جن کا سلسلہ جاری ہے، وہ مسلمانوں کے لیے انتہائی موجب اذیت ہیں۔ میں "حملے" کا لفظ قصداً استعمال کر رہا ہوں تاکہ آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہماری شکایت معقول علمی تنقید

کے خلاف ہے علمی تنقید اگر دلیل کے ساتھ اور تہذیب و شائستگی کے حدود میں ہو تو خواہ وہ کیسے ہی سخت اعتراضات پر مشتمل ہو، ہم اس کو برا نہیں مانتے بلکہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن ہمیں، بجا طور پر شکایت اُن حملوں کے خلاف ہے جو جھوٹے اور رکیک الزامات کی صورت میں اور نہایت دل آزار زبان میں کیے جاتے رہے اور اب تک کیے جا رہے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انتہائی ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہیں اور ان کے متعلق کوئی خلافِ ادب بات زبان سے نکالنا ہمارے عقیدے میں کفر ہے۔ آپ کوئی مثال ایسی نہیں پا سکتے کہ کسی مسلمان نے کبھی سیدنا مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کی شان میں کوئی بے ادبی کی ہو۔ اگرچہ ہم حضرت مسیح کی الوہیت کے قائل نہیں ہیں، مگر ان کی نبوت پر ہمارا ویسا ہی ایمان ہے جیسا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ہے، اور کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن پر اور دوسرے انبیاء پر بھی ایمان نہ لائے۔ اسی طرح ہم صرف قرآن ہی کو نہیں بلکہ تورات اور انجیل کو بھی خدا کی کتابیں تسلیم کرتے ہیں اور کوئی مسلمان ان مقدس کتابوں کی توہین کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ ہماری طرف سے اگر کبھی کوئی بحث ہوئی ہے تو اس حیثیت سے ہوئی ہے کہ بائبل جس شکل میں اب پائی جاتی ہے یہ کہاں تک مستند ہے؟ اور یہ بحث خود مسیحی علماء بھی کرتے رہے ہیں۔ کسی مسلمان نے کبھی اس کا انکار نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ اور بائبل کے دوسرے انبیاء پر اللہ کا کلام نازل ہوا تھا اور مسلمان چاہے یہ بات نہ مانتے ہوں کہ اس وقت پائی جانے والی پوری بائبل اللہ کا کلام ہے، مگر یہ ضرور مانتے ہیں کہ اس میں اللہ کا کلام موجود ہے۔ لہٰذا ہمارے مسیحی بھائیوں کو ہم سے یہ شکایت کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا ہے کہ ہم ان کے انبیاء کی یا ان کی کتب مقدسہ کی توہین کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے ہمیں آئے دن ان سے یہ رنج پہنچتا رہتا ہے، اور صدیوں سے اس دل آزاری کا سلسلہ چل رہا ہے کہ ان کے مصنفین اور مقررین ہمارے نبی اور ہماری کتاب مقدس اور ہمارے دین پر سخت حملے کرتے ہیں۔ دنیا کی اسلامی اور مسیحی برادریوں کے درمیان تعلقات کی خرابی کا یہ ایک اہم سبب ہے، اس سے شدید باہمی منافرت پیدا ہوتی ہے، اور مزید براں اس ناروا پروپیگنڈے کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مسیحی عوام کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و تحقیر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ آپ دنیا کے امن کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔ اگر مسیحیت کے پیروؤں کو اس طرزِ عمل میں کم از کم اتنی اصلاح کر لینے کی نصیحت کریں کہ یہ دل آزاری اور نفرت انگیزی کی حد تک نہ پہنچے۔

۲۔ مسیحی مشن اور مشنری ایک مدتِ دراز سے مسلم ممالک میں مسیحیت پھیلانے کے لیے جو جو طریقے استعمال کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں، وہ بھی دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک بڑی وجہ شکایت ہیں۔ دوسرے ملکوں اور آبادیوں میں ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ انہوں نے محض "تبلیغ" پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس سے تجاوز کر کے دوسرے متعدد ایسے طریقے اختیار کیے ہیں جو تبلیغ کے بجائے سیاسی دباؤ، معاشی طمع و تحریص اور اخلاقی اعتقادی تخریب کی تعریف میں آتے ہیں، جنہیں مشکل ہی سے کوئی معقول آدمی اشاعت مذہب کے جائز ذرائع تسلیم کر سکتا ہے۔ افریقہ کے ایک بڑے حصے میں انہوں نے استعماری طاقتوں کی مدد سے مسلمانوں کو تعلیم سے محروم کیا، اور درس گاہوں کے دروازے ہر اس شخص پر بند کر دیے جو مسیحیت قبول نہ کرے یا کم از کم اپنا اسلامی نام ترک کر کے مسیحی نام نہ اختیار کر لے۔ اس طریقے سے جو باثر مسیحی اقلیت پیدا کی گئی، آزادی کا دور آنے کے بعد آج وہ بہت سی ان افریقی ریاستوں پر سیاسی، فوجی اور معاشی حیثیت سے غالب ہے جن کی بیشتر آبادی مسلمان ہے۔ یہ ایک صریح ناانصافی تھی جو مسلم اکثریت رکھنے والے افریقی ملکوں کے ساتھ کی گئی۔ سوڈان میں برطانوی استعمار کی مدد سے مشنریوں نے جنوبی حصے کو اپنے لیے "محفوظ علاقہ" بنوا لیا جس میں تعلیم اور تبلیغ کا حق صرف مسیحی مشنریوں کے لیے مختص کر دیا گیا اور مسلمانوں کے لیے تبلیغ تو درکنار، دوسری اغراض تک کے لیے وہاں جانے پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کو کسی دلیل سے بھی اشاعت مذہب کا جائز و معقول طریقہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں ہسپتالوں اور درس گاہوں کا معروف طریق کار یہ ہے کہ وہ مسلمان مریضوں اور طلبہ سے بے تحاشا فیسیں وصول کرتے ہیں، اور جو غریب آدمی عیسائیت قبول کرے اسے علاج اور تعلیم کی سہولتیں مفت یا برائے نام خرچ پر بہم پہنچاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تبلیغ نہیں بلکہ ضمیر و ایمان کی خرید و فروخت ہے۔ علاوہ بریں ان کی درس گاہیں ہمارے ہاں ایک ایسی نسل تیار کر رہی ہیں جو نہ مسیحیت اختیار کرتی ہے، نہ مسلمان رہتی ہے، بلکہ اپنے اخلاق و تہذیب، زبان اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے ایک اجنبی عنصر بن کر رہ جاتی ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے اندر مسیحیت یا اسلام کے بجائے الحاد و بے دینی کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی معقول آدمی یہ مان سکتا ہے کہ یہ مذہب کی خدمت ہے جو مسیحی مشن انجام دے رہے ہیں۔ یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر مسلمان ملکوں میں عموماً ان مشنوں کو مذہبی تبلیغ کے بجائے اسلام اور مسلم معاشرے کے خلاف ایک سازش سمجھا جاتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس کے نتائج پر غور فرمائیں اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مشنری اداروں کے طرزِ تبلیغ

میں اصلاح کی کوشش کریں۔

۳۔ مسیحی دنیا کے متعلق مسلمانوں کا عام احساس یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک شدید جذبۂ عناد رکھتی ہے اور آئے دن ایسے تجربات ہوتے رہتے ہیں جو اس احساس کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس کا تازہ ترین تجربہ وہ ہے جو ابھی حال میں عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر ہوا۔ اس لڑائی میں اسرائیل کی فتح پر یورپ اور امریکہ کے بیشتر ملکوں میں جس طرح خوشیاں منائی گئیں انہوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل میں زخم ڈال دیے ہیں۔ آپ شاید ہی کوئی مسلمان ایسا پائیں گے جس نے عربوں کی شکست اور اسرائیل کی فتح پر مسیحی دنیا کے اس علی الاعلان اظہارِ مسرت و شادمانی اور اسرائیل کی کھلی کھلی حمایت کو دیکھ کر یہ محسوس نہ کیا ہو کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسیحیوں کے گہرے جذبۂ عناد کا مظاہرہ تھا۔ فلسطین میں اسرائیل کی ریاست جس طرح بنی ہے، بلکہ بنائی گئی ہے، اس کی تاریخ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دو ہزار برس سے فلسطین عرب آبادی کا وطن تھا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں وہاں یہودی ۸ فی صد سے زیادہ نہ تھے۔ اس حالت میں برطانوی حکومت نے اس کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا فیصلہ کیا اور مجلس اقوام نے نہ صرف اس فیصلے کی توثیق کی بلکہ برطانوی حکومت کو فلسطین کا مینڈیٹ دیتے ہوئے یہ ہدایت کی کہ وہ یہودی ایجنسی کو باقاعدہ شریکِ حکومت بنا کر اس تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے بعد دنیا بھر کے یہودیوں کو لا لا کر ہر ممکن تدبیر سے فلسطین میں بسانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ۳۰ سال کے اندر ان کی آبادی ۳۳ فی صد تک پہنچ گئی۔ یہ ایک صریح ظلم تھا جس کے ذریعے سے ایک قوم کے وطن میں زبردستی ایک دوسری اجنبی قوم کا وطن بنایا گیا۔ پھر دوسرا اس سے بھی ظالمانہ قدم اٹھایا گیا اور امریکہ نے کھلے بندوں دباؤ ڈال کر اقوام متحدہ سے یہ فیصلہ کرایا کہ یہودیوں کے اس مصنوعی قومی وطن کو یہودی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کی رُو سے ۳۳ فی صد یہودی آبادی کو فلسطین کا ۵۵ فی صدی اور عربوں کی ۶۷ فی صدی آبادی کو ۴۵ فی صدی رقبہ الاٹ کیا گیا تھا۔ لیکن یہودیوں نے لڑ کر طاقت کے بل پر اس ملک کا ۷۷ فی صدی رقبہ حاصل کر لیا، اور مار دھاڑ اور قتل و غارت کے ذریعہ سے لاکھوں عربوں کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ یہ ہے اسرائیل کی اصل حقیقت۔ کیا دنیا کا کوئی انصاف پسند اور ایمان دار آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک جائز ریاست ہے جو فطری اور منصفانہ طریق سے بنی ہے؟ اس کا تو عین وجود ہی ایک بدترین جارحیت ہے اور اس پر مزید ظلم یہ ہے کہ یہودی صرف ان حدود کے اندر محدود رہنے پر بھی راضی نہیں ہیں جو انھوں نے فلسطین میں

زبردستی حاصل کی ہیں، بلکہ وہ سالہا سال سے علانیہ کہہ رہے ہیں کہ نیل سے فرات تک کا پورا علاقہ ان کا قومی وطن ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ قوم ہر وقت یہ جارحانہ ارادہ رکھتی ہے کہ اس پورے علاقے پر جبراً قبضہ کرے اور اس کے اصل باشندوں کو زبردستی نکال کر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے یہودیوں کو وہاں لاکر بسائے۔ اسی جارحانہ سکیم کا ایک جز گذشتہ ماہ جون کا وہ اچانک حملہ تھا جس کے ذریعے سے اسرائیل نے ۲۶ ہزار مربع میل علاقے پر قبضہ کیا۔ اس پورے ظلم کی ذمہ دار مسیحی دنیا ہے۔ اس نے ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن زبردستی بنوایا۔ اس نے اس مصنوعی قومی وطن کو ایک ریاست میں تبدیل کرایا۔ اس نے اس جارح ریاست کو روپے اور ہتھیاروں سے مدد دے کر اتنا طاقت ور بنایا کہ وہ زبردستی اپنے توسیعی منصوبوں کو عمل میں لاسکے اور اب اس ریاست کی تازہ فتوحات پر یہی مسیحی دنیا جشن شادمانی منا رہی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد نہ صرف عربوں میں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں مسیحیوں کی انصاف پسندی، ان کی خیر اندیشی اور مذہبی عناد و تعصب سے ان کی بریت پر کوئی اعتماد باقی رہ گیا ہے؟ اور کیا آپ کا خیال ہے کہ دنیا میں امن قائم کرنے کے یہی طریقے ہیں؟ یہ دراصل ہمارا نہیں بلکہ آپ کا کام ہے کہ مسیحی بھائیوں کو اس روش پر شرم دلائیں اور ان کی روح کو اس گندگی سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔

۴۔ اس سلسلے میں ایک زیادتی ایسی بھی ہے جو خود آپ کی طرف سے ہو رہی ہے، اگرچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ ہے اور آپ کو غالباً یہ احساس نہیں ہے کہ درحقیقت وہ ایک زیادتی ہے۔ میرا اشارہ آپ کی اس تجویز کی طرف ہے کہ قدیم بیت المقدس کو بین الاقوامی کنٹرول میں دے دیا جائے۔ آپ یہ تجویز شاید اس خیال سے پیش کر رہے ہیں کہ اس طرح یہ مقدس شہر لڑائی جھگڑے سے محفوظ رہے گا۔ لیکن درحقیقت اس کا نتیجہ ایک اور ظلم کی شکل میں رونما ہوگا۔ ظاہر ہے کہ بین الاقوامی کنٹرول اسی بین الاقوامی ادارے کے ہاتھ میں ہوگا جس نے اسرائیل کی یہ مصنوعی ریاست بنائی ہے اور جو آج تک اسرائیل کی کسی جارحیت کو نہ روک سکا ہے نہ اس کے ہو جانے کے بعد اس کا تدارک کر سکا ہے۔ اُس ادارے کے کنٹرول میں جب یہ شہر آجائے گا تو وہ یہودیوں کے لیے بیت المقدس میں آباد ہونے کے دروازے اسی طرح چوپٹ کھول دے گا جس طرح مجلس اقوام کے انتداب کے تحت برطانوی حکومت نے یہودی مہاجرین کے لیے فلسطین کے دروازے کھولے تھے، اور پھر یہودیوں کو بیت المقدس کی زمینیں اور عمارتیں خریدنے کی وہی سب سہولتیں بھی فراہم کر دی جائیں گی جو برطانوی انتداب اس سے پہلے فلسطین میں ان کو فراہم کر چکا

ہے۔ اس طرح تھوڑی ہی مدت کے اندر یہ شہر عملاً یہودی شہر بن جائے گا اور وہ یہودی اس پر قابض ہوں گے جن کے دلوں میں نہ مسیحی مقدسات کا کوئی احترام ہے نہ اسلامی مقدسات کا۔

میں آپ کے پیغام کے جواب میں اس طویل مراسلے اور اس صاف گوئی پر معذرت خواہ ہوں۔ مگر میں آپ کو یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ قیامِ امن کی اصل رکاوٹیں کیا ہیں جنہیں دور کرنے کے لیے عملاً کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ میں پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ اگر اسلامی دنیا کی طرف سے کوئی ایسی بات ہو جسے امن عالم کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جائے تو وہ مجھے بتائی جائے۔ مجھ کو جو تھوڑا بہت اثر دنیائے اسلام میں حاصل ہے اسے میں خود بھی اس رکاوٹ کے دُور کرنے میں استعمال کروں گا اور دوسرے زعمائے اسلام کو بھی اس کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

فصل ۳

# ضمیمہ (۳)

## پاکستان میں مسیحیت کی ترقی کے اصل وجوہؒ

جن فتنوں کے پھیلنے کا انحصار نشر و تبلیغ پر ہو، ان کا مقابلہ تو بے شک نشر و تبلیغ سے کیا جا سکتا ہے اور اس کام میں دانستہ کوتاہی میں نے کبھی نہیں کی ہے۔ لیکن جن فتنوں کو پھیلانے میں اختیارات کی طاقت کارفرما ہو ان کے علاج کی کوئی صورت اُس طاقت کی اصلاح یا تبدیلی کے سوا نہیں ہے۔ ان کو محض نشر و تبلیغ سے نہیں روکا جا سکتا۔

جو لوگ اس ملک میں عیسائیت قبول کر رہے ہیں یا پہلے جنھوں نے قبول کی ہے، ان میں سے بہت ہی کم ایسے ہوں گے جنہوں نے دلیل کی بنا پر یہ مان لیا ہو کہ خدا تین ہیں، یا حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے تھے یا ایک شخص کا سولی پر چڑھ جانا دوسروں کے گناہوں کا کفارہ ہو سکتا ہے۔ اُس کے عقائد کو صحیح مان کر، اور اسلام کے معقول عقائد کو غلط سمجھ کر مسلمانوں میں سے عیسائی بن جانے والے آخر کتنے ہو سکتے ہیں۔ دراصل جو چیز لوگوں کو عیسائیت کی آغوش میں کھینچے لیے جا رہی ہے وہ مسیحی مشنریوں کی تبلیغ نہیں بلکہ مشن ہسپتالوں اور سکولوں کی کارگزاری ہے جسے فروغ دینے میں ہماری اپنی حکومت کی بالواسطہ اور بلاواسطہ امداد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس پر مزید وہ غیر معمولی اثر و رسوخ ہے جو عیسائی پادریوں کو ہمارے حکام عالی مقام کی بارگاہوں میں حاصل ہے، یہ عیسائیت کے پھیلنے میں مددگار ہو رہا ہے۔ ان اسباب کی جب تک روک تھام نہ ہو، میری، آپ کی یا تمام علماء کی مجموعی تبلیغ سے بھی کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

عیسائی ہسپتالوں میں ہر شخص جا کر خود دیکھ سکتا ہے کہ وہ نہ بے غرض خدمتِ خلق کے ادارے ہیں اور نہ علاج کے تجارتی ادارے بلکہ ان میں کھلم کھلا ایمان خریدنے کا کاروبار ہو رہا ہے۔ ان اداروں میں مسلمانوں سے علاج کی خوب فیسیں لی جاتی ہیں اور عیسائیوں کا مفت علاج ہوتا ہے اور اس کے ساتھ

---

ؒ ایک خط کے جواب میں مؤلف نے مکتوب الیہ کو جواب دیا تھا۔

دینِ مسیحی کی تبلیغ بھی مریضوں پر کی جاتی ہے۔ اس حالت میں ایک غریب آدمی کے لیے جو اپنا یا اپنے کسی عزیز کا علاج کرانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اس امر کی بہت بڑی تحریص موجود ہے کہ اپنا دین تبدیل کر کے علاج کی سہولتیں حاصل کر لے۔

مسیحی مدرسوں اور کالجوں میں بھی یہی صورتِ حال ہے کہ ان میں مسلمانوں سے خوب فیسیں لی جاتی ہیں اور عیسائیوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے، بلکہ ان کے لیے بیرونی ممالک میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں فراہم کر دی جاتی ہیں۔ یہاں پھر غریبوں کے لیے یہ تحریص موجود ہے کہ جو تعلیم وہ اپنے بچوں کو خود نہیں دلا سکتے، اس کا انتظام محض مذہب تبدیل کرنے سے ہو سکتا ہے اور دنیوی ترقی کے دروازے ان کے لیے کھل سکتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے ادارے ہمارے ملک میں ایک طرف تو بیرونی روپے سے چل رہے ہیں اور دوسری طرف ہماری اپنی حکومت ہر طرح ان کی امداد کر رہی ہے۔ ان کو گرانٹ دی جاتی ہے۔ ان کو زمینیں دی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ وہ رعایتیں کی جاتی ہیں جو خود مسلمانوں کے مذہبی اداروں کے ساتھ کبھی نہیں کی گئیں اور ان کے معاملہ میں اس سوال سے بالکل آنکھیں بند کر لی گئی ہیں کہ باہر سے آنے والا یہ روپیہ جو ان اداروں پر خرچ ہو رہا ہے، اور غیر ممالک کے مشنری ہمارے شہروں اور دیہات میں پھیل کر اس روپے سے جو کام لے رہے ہیں، اس کے پیچھے خالص دینی تبلیغ کے علاوہ اور کیا اغراض کارفرما ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے اپنے ہی حکمران مذہبی اداروں کے تمام معقول حدود سے تجاوز کر کے اس بات پر نہ صرف راضی ہیں بلکہ اس میں خود مددگار بن رہے ہیں کہ دوسرے لوگ روپے کے زور سے مسلمانوں کے ایمان خرید لیں۔

مسیحی پادریوں کے اثر و رسوخ کا یہ حال ہے کہ آج ہمارے دیہاتی علاقوں میں غیر مسیحی عوام کو ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لیے کوئی تحفظ حاصل نہیں لیکن ہر جگہ مسیحی برادری کا پشت پناہ ایک پادری موجود ہے جو تھانے سے لے کر سیکرٹریٹ تک ہر درجے اور مرتبے کے حکام سے مسیحیوں کو نہ صرف انصاف دلواتا ہے بلکہ ان کے لیے بے جا رعایتیں تک حاصل کر لیتا ہے۔ مسلمانوں کے کسی عالم کو ان حاکموں کی بارگاہوں میں وہ رسائی حاصل نہیں ہے جو عیسائی پادریوں کو حاصل ہے۔ مسلمان علماء ان تمام حکام کی نگاہوں میں ویسے ہی ذلیل و خوار ہیں جیسے انگریز حاکموں کی نگاہ میں کبھی تھے۔ مگر مسیحی پادری ان کا بھی اسی طرح "فادر"

ہے جس طرح انگریز حاکموں کا تھا۔ یہ ایک اور سبب ہے جس کی بنا پر دیہات کے بے سہارا لوگ اپنے آپ کو پولیس اور زمینداروں اور بااثر غنڈوں کے ظلم سے بچانے کے لیے مسیحیت میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

یہ تو غریبوں میں مسیحیت کے پھیلنے کے اسباب ہیں۔ رہے کھاتے پیتے طبقے، تو ہماری حکومت ہی کی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ خوشحال لوگ اپنی اولاد کو اردو زبان اور اپنی قومی تہذیب اور اپنے دین کی تعلیم و تربیت دینا لاحاصل سمجھتے ہیں اور ان کو ایسی تعلیم و تربیت دلوانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے وہ زبان اور اطوار و عادات کے اعتبار سے پورے انگریز یا امریکی بن جائیں۔ اس غرض کے لیے وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو مسیحی اداروں میں بھیجتے ہیں جہاں کا پورا ماحول ان کو اسلام اور اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی تعلیمات سے محض ناواقف ہی نہیں بلکہ منحرف اور باغی بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر یہ نوجوان عیسائی نہ بھی بنیں تو بہر حال مسلمان تو نہیں رہتے، بلکہ مسلمانوں کی بہ نسبت عیسائیوں سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ تعلیم سے فارغ ہو کر ہمارے بڑے بڑے افسر بنتے ہیں اور اونچے عہدے انہی کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ کیا ان سے کوئی یہ امید کر سکتا ہے کہ ان کی ہمدردیاں مسیحیت کے مقابلے میں کبھی اسلام کے ساتھ ہو سکیں گی اور مسیحیت کے فروغ کو روکنے کا کوئی جذبہ ان میں پیدا ہو سکے گا؟

ان حالات میں محض مسیحی عقائد کی تردید میں مضامین لکھنے یا گاؤں گاؤں تبلیغ کے لیے دورے کرنے سے مسیحیت کے اس سیلاب کو کہاں تک روکا جا سکتا ہے۔

اِدارہ ترجمان القرآن لاہور